درس ۲

اقامتِ دین کے لیے کام کرنے والوں کے

مطلوبہ اوصاف

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم ...... امَّا بَعدُ:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیۡدًا ﴿۲۸﴾ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ تَرٰىهُمۡ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضۡوَانًا ۫ سِیۡمَاهُمۡ فِیۡ وُجُوۡهِهِمۡ مِّنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ ۚۖ وَمَثَلُهُمۡ فِی الۡاِنۡجِیۡلِ ۚ كَزَرۡعٍ اَخۡرَجَ شَطۡـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسۡتَغۡلَظَ فَاسۡتَوٰی عَلٰی سُوۡقِهٖ یُعۡجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیۡظَ بِهِمُ الۡكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنۡهُمۡ مَّغۡفِرَةً وَّاَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۲۹﴾﴾ (الفتح)... صدق اللّٰہ العظیم

اس منتخب نصاب (۲) کا اصل موضوع ''اقامت دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت کے اوصاف اور اس کے تنظیمی مسائل'' ہے۔ چنانچہ اس موضوع سے متعلق قرآن مجید کے کچھ مقامات منتخب کر کے اس میں شامل کیے گئے ہیں۔ اس کے اوّلین دو مقامات درحقیقت اُس پہلے اور اصل منتخب نصاب اور اِس دوسرے منتخب نصاب کے مابین نقطۂ اتصال ہیں اور ان کے باہمی ربط کو ظاہر کر رہے ہیں۔ سورۃ الحج کی آخری دو آیات میں شہادت علی الناس کا تصور ہمارے سامنے آیا: ﴿لِیَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَهِیۡدًا عَلَیۡكُمۡ وَتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ۚ﴾ ''تاکہ رسولؐ گواہ ہو جائے تم پر اور تم گواہ ہو جاؤ لوگوں پر''۔ اور شہادت علی الناس کی ذمہ داری کو ادا کرنے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جہاد کا ذکر آیا: ﴿وَجَاهِدُوۡا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجۡتَبٰىكُمۡ﴾ ''جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ اس کے لیے جہاد کا حق ہے۔ اس نے تمہیں (اس مقصد کے لیے) چن لیا ہے۔'' درحقیقت اب اس کا تعلق سورۃ الصّف سے جڑ رہا ہے جس میں نہ صرف جہاد بلکہ قتال کا تصور دیا گیا ہے۔ سورۃ الصّف کی مرکزی آیات یہ ہیں:

﴿هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ ﴿۹﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا هَلۡ اَدُلُّكُمۡ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنۡجِیۡكُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَتُجَاهِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِكُمۡ وَاَنۡفُسِكُمۡ ؕ ذٰلِكُمۡ خَیۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۱﴾﴾

چنانچہ ازروئے قرآن جہاد فی سبیل اللہ کا پہلا ہدف ہے ''شہادت علی الناس'' اور دوسرا ہدف ہے ''اظہارُ دینِ الحقّ علی الدِّینِ کُلِّہٖ'' یعنی دین حق کو کُل کے کُل دین پر غالب کر دینا۔ سورۃ الصّف ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے اور متذکرہ بالا آیات اس کی مرکزی آیات ہیں' لہٰذا اس ضمن میں ہمارے منتخب نصاب کے دروس میں پورے شرح و بسط کے ساتھ بیان ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کہ ان آیات میں سے پہلی آیت' جس کو ایک روایت کے مطابق امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے پورے قرآن مجید کا عمود قرار دیا ﴿هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ﴾ اس پر اللہ کے فضل و کرم سے نہ صرف ہمارے منتخب نصاب کے دروس میں تفصیل موجود ہے' بلکہ بڑی طویل بحثیں موجود ہیں۔

چند مغالطے اور اُن کا ازالہ

میرے اکثر و بیشتر کتابچے بلکہ بڑی کتابیں بھی میرے دروس و خطابات پر مشتمل ہیں' جنہیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا گیا ہے' لیکن مجھ پر اللہ کا بڑا اکرم ہوا ہے کہ چند اہم موضوعات پر میرے قلم سے کچھ تحریریں نکلی ہیں اور شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے (جیسا کہ گزشتہ نشست میں عرض کیا گیا) ''نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت'' نہایت اہمیت کی حامل تحریر ہے اور اس میں ۲۴ صفحات کا مقالہ اس ایک آیت پر مشتمل ہے: ﴿هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ﴾ اس مقالہ میں مَیں نے اللہ

کے فضل و کرم سے اس آیت مبارکہ کے ضمن میں جو بھی ممکن سوال ہو سکتا تھا اس سے بحث کی ہے۔ اس کی ساری لغوی شرح و تراکیب ضمائر کے جتنے بھی ممکنہ مراجع ہو سکتے ہیں اور اس بارے میں جتنی آراء پیش کی گئی ہیں ان کو سامنے رکھ کر سیر حاصل گفتگو کر چکا ہوں اور اس میں کسی اشتباہ کا امکان باقی نہیں رہا۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے بعض دانشور حضرات کا حال علامہ اقبال کے اس شعر کا مصداق ہے ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجے فقیہانِ حرم بے توفیق!

چنانچہ ایک صاحب نے اس بارے میں ہمارے موقف پر جرح کی ہے اور اس پر اعتراضات وارد کیے ہیں۔ اس آیۂ مبارکہ کے ضمن میں جو کچھ ہم بیان کرتے رہے ہیں اس پر ان صاحب نے اعتراض کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اس آیت سے یہ مراد لینا کہ پورے کرۂ ارضی اور روئے زمین پر اللہ کے دین کو غالب کرنا نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی غرض اور مقصد ہے، غلط ہے، بلکہ ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ سے مراد صرف جزیرہ نمائے عرب کے ادیان پر دینِ حق کو غالب کر دینا ہے اور یہی درحقیقت رسولِ اکرم ﷺ کا فرضِ منصبی تھا، جو آپؐ نے ادا فرما دیا۔

یہ بات اگر اس انداز میں کہی جائے کہ اوّلین فریضہ جو بنفسِ نفیس محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے پورا ہونا تھا وہ جزیرہ نمائے عرب پر دین اسلام کا غلبہ تھا، تو اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ بات تو ہم بھی بیان کرتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک ترتیب و تدریج ہے۔ جیسا کہ ''شہادت علی الناس'' کے ضمن میں اگرچہ حضور ﷺ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کی طرف ہے اور ہر انسان جو قیامت تک اس دنیا میں آئے گا وہ درحقیقت حضور ﷺ کی اُمتِ دعوت میں شامل ہے، لیکن اس شہادت علی الناس کی ذمہ داری کی ترتیب یہ قائم ہوئی کہ حضور ﷺ نے بنفسِ نفیس اہل عرب کو تبلیغ فرمائی اور ان میں ایک اُمت برپا کر دی۔ اور اس طرح جو اُمت وجود میں آئی اب تا قیامِ قیامت اس تبلیغ کی ذمہ داری اس کے حوالے کر دی۔ اس طرح شہادت علی الناس کی یہ ذمہ داری نبیٔ اکرم ﷺ کے ذریعے سے دو مرحلوں میں پوری ہوئی۔ پہلے مرحلہ میں حضور ﷺ نے خود اِس ذمہ داری کو پورا فرمایا اور اس کی دوسرے مرحلے میں تکمیل بذریعہ اُمتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہوگی۔ یہ بات بالکل دو اور دو چار کی طرح واضح ہے اور اس میں کوئی اشکال نہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ کے فرمان ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آيَةً))[1] میں درحقیقت اسی فرضِ منصبی کی تاکید ہے کہ ہر اُمتی اس ذمہ داری کی تکمیل میں حصّہ لے، خواہ ایک ہی آیت کی حد تک لے۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔

اور یہاں ''عَنِّیْ'' کا اصل مفہوم انگریزی زبان میں اردو کی نسبت زیادہ واضح طور پر ''on my behalf'' کے الفاظ سے ادا ہوتا ہے۔ جو شخص بھی تبلیغ کر رہا ہے، جس نے بھی کی ہے، وہ معین الدین اجمیریؒ ہوں یا علی ہجویریؒ ہوں، جو بھی اللہ تعالیٰ کے اس پیغام کو لے کر کہیں بھی گیا ہے تو یہ درحقیقت تبلیغِ محمدیؐ ہے۔ یہ آپ ﷺ ہی کا فیض ہے جو جاری ہے۔ جو کوئی بھی یہ تبلیغ کر رہا ہے وہ آپ ﷺ ہی کی جانب سے، آپؐ ہی کے behalf پر کر رہا ہے اور جو کوئی کرے گا وہ بھی آپ ﷺ ہی کے behalf پر کرے گا۔

بالکل یہی ترتیب و تدریج ''اظهارُ دينِ الحقّ على الدِّينِ كُلِّهٖ'' میں ہے کہ حضور ﷺ نے جزیرہ نمائے عرب پر دین کو غالب کر دیا اور اس حد تک غلبۂ دین کی تکمیل ہو گئی۔ اب اس عمل کو آخری مرحلے اور آخری درجے تک پہنچانا اُمت کی ذمہ داری ہے، لیکن اس ضمن میں اُمت کے ہاتھوں جو کچھ ہوگا وہ بھی اصل میں حضور ﷺ ہی کا فیض ہے۔ لہٰذا اس تدریج کو اگر یہاں بیان کیا جائے تو قطعاً کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اگر اس معاملے کو محدود کر دیا جائے تو یہ غلط ہوگا۔

دراصل اِن حضرات نے اصل ٹھوکر سورۃ الجمعۃ میں وارد الفاظ ﴿وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ کا مفہوم سمجھنے میں کھائی ہے۔ سورۃ الجمعۃ کی دوسری آیت یوں ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ......﴾ ''وہی ہے (اللہ) جس نے اٹھایا اُمّیین میں سے ایک رسول انہی میں سے......''۔ اور اگلی آیت میں عطف آتا ہے: ﴿وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ ''اور دوسرے انہی میں سے جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے۔'' ان حضرات نے یہ رائے قائم کر لی کہ ''اٰخَرِيْنَ'' سے مراد بھی عرب ہی کے لوگ ہیں کہ جو اس آیت کے نزول تک ایمان نہیں لائے تھے، بعد میں ایمان لائے۔

''اٰخَرِيْنَ'' کے اس مفہوم سے ہمیں اختلاف ہے، کیونکہ اوّلاً تو یہ بات اس کلام کی عظمت کے منافی ہے، اس لیے کہ یہاں عطف جس اہتمام سے لایا جا رہا ہے یہ اس کے ساتھ مناسبت رکھنے والی بات نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے بارے میں ہمارے پاس ایک صحیح حدیثِ مرفوع موجود ہے۔ قرآن مجید کے بہت سے مقامات ایسے ہیں کہ اُن کے بارے میں حضور ﷺ سے سوال کیا گیا اور آپؐ نے اس کا جواب ارشاد فرمایا۔ اب رسول اللہ ﷺ کی وضاحت کے بعد بھی کسی اور طرف دیکھنا اور اِدھر اُدھر جھانکنا تو درحقیقت حدیثِ نبویؐ سے اعراض کی صورت ہو جائے گی، اس لیے کہ قرآن مجید کے اجمال کی تفصیل اور قرآن مجید میں اگر کہیں وضاحت مطلوب ہے تو اس کی توضیح اور تبیین بھی درحقیقت فرضِ منصبی ہے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا۔ چنانچہ قرآن کے کسی مقام کی وضاحت میں جب ہمیں رسول اللہ ﷺ کا کوئی قول مل جاتا ہے تو دیگر اقوال کی کوئی حیثیت نہیں رہ

جاتی۔ مثال کے طور پر حروفِ مقطعات کے بارے میں اگر ہمیں حضورﷺ سے کوئی مرفوع قول مل جائے تو ہمیں اِس وادی اور اُس وادی میں سرگردانی کی کوئی احتیاج نہیں۔ حروفِ مقطعات کے ضمن میں مَیں نے بارہا کہا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ایک قول ہمیں ملتا ہے لیکن مرفوع نہیں ہے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ ان کا اپنا ایک وجدانی اور ذوقی خیال ہے‘ لہٰذا اُمت میں سے کسی نے چاہا تو قبول کیا‘ کسی نے چاہا تو قبول نہیں کیا۔ لیکن اگر مرفوع قول ہوتا کہ حضورﷺ نے یہ فرمایا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ ہمارے لیے اسے قبول کرنے کے سوا قطعاً کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ بلکہ اگر کوئی شخص قولِ رسولؐ کی موجودگی میں کسی اور قول کی طرف التفات کرتا ہے یا اپنی رائے ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ نبی اکرمﷺ کے مقام و مرتبہ سے آگاہ نہیں ہے۔ بدقسمتی سے اس معاملہ میں ان صاحب سے یہی ہوا۔

حضورﷺ کی متفق علیہ مرفوع حدیث موجود ہے‘ حضورﷺ سے پوچھا گیا کہ ''اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ'' کون ہیں؟ اسی محفل میں حضرت سلمان فارسیؓ موجود تھے‘ آپؐ نے ان کی طرف اشارہ فرمایا۔ یعنی ''اس کی قوم''۔ اور پھر آپؐ نے فرمایا کہ ایمان اگر ثریا پر بھی ہوگا تو اس کی قوم کا کوئی فرد وہاں سے بھی لے آئے گا۔ ایک روایت میں ''ایمان'' کی جگہ ''علم'' کا لفظ ہے۔ اور اس سے مراد صرف ایرانی قوم نہیں‘ بلکہ یوں سمجھئے کہ حضورﷺ نے آریائی نسل کے خاص وصف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آریائی نسل میں علم وحکمت‘ فلسفہ اور منطق کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ آریائی نسل یونان‘ ایران اور ہندوستان میں آباد ہوئی اور دنیا میں علم اور فلسفہ وحکمت کے یہی تین عظیم مراکز رہے ہیں۔ فلسفہ ومنطق‘ مسائل کی گہرائی میں جانا‘ بال کی کھال اُتارنا اور حقیقت تک اپنی عقل کے ذریعے سے پہنچنے کی کوشش کرنا آریائی نسل کا ایک خصوصی وصف اور ان کے مزاج کا جزوِ لاینفک ہے۔ اور جب ﴿اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ﴾ کے بارے میں رسول اللہﷺ کی صراحت موجود ہے تو اس کے بعد اب اس کی کوئی اور توجیہہ کرنا درست نہیں ہے‘ بلکہ یہ رسول اللہﷺ کے قول کا استخفاف ہے۔

اس کے علاوہ ان صاحب نے جو ستم ڈھایا ہے اس کو میں تحریف فی الترجمہ کہوں گا۔ میرے نزدیک یہ قرآن مجید میں تحریف کے ہم وزن بات ہے۔ اس سے پہلے یہ ہوتا رہا ہے کہ قرآن مجید کی کسی آیت کے مفہوم میں اگر مترجم نے یہ سمجھا کہ کچھ الفاظ مقدر ہیں تو بریکٹ میں ان کو شامل کر دیا جاتا ہے۔ یہ کام مولانا ابوالکلام آزاد نے کثرت سے کیا ہے۔ اس سے پہلے کے تراجم میں ہمیں یہ چیزیں نہیں ملتیں۔ جس دَور میں یہ ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ قرآن مجید کا لفظی ترجمہ کیا جائے اُس وقت احتیاط کی وہ انتہا تھی کہ ہر لفظ کے نیچے اس کا ترجمہ آئے‘ چاہے اردو میں جملے کی ترکیب کا حق ادا نہ ہو‘ تقدیم وتأخیر ہو جائے‘ کوئی پرواہ نہیں‘ لیکن قرآنی الفاظ کی ترتیب برقرار رہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کا لفظی ہی نہیں لفظ بلفظ ترجمہ کیا جاتا تا کہ مفہوم میں کسی اونچ نیچ کی کوئی ذمہ داری مترجم پر نہ آئے۔ پھر ایک رجحان یہ آیا کہ ترجمہ کو بامحاورہ کرنے کی کوشش کی جائے‘ چاہے الفاظ میں کچھ تقدیم و تأخیر ہو جائے‘ لیکن پھر بھی التزام کیا گیا کہ لفظی ترجمہ ہو۔

بیسویں صدی کے تراجم میں ایک نیا ذوق پیدا ہوا کہ ایسا ترجمہ ہو جس کو پڑھ کر انسان اس کے مفہوم کو پوری طرح سمجھ لے۔ لہٰذا اس میں کچھ اضافے قوسین (بریکٹ) میں کرنے کا آغاز کیا گیا۔ بریکٹ میں اضافہ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ الفاظ قرآن کے متن میں نہیں ہیں‘ لیکن مترجم کے نزدیک ان الفاظ کے اضافے سے اس آیت کا مفہوم رواں بن جاتا ہے اور بات واضح ہو جاتی ہے۔ اس کا آغاز مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا فتح محمد جالندھریؒ کے تراجم میں بھی قوسین (brackets) کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی توجیہات و تأویلات کو بھی ترجمہ میں شامل کیا ہے‘ مگر قوسین کے اندر۔ لیکن آج یہ غضب ڈھایا گیا ہے کہ ﴿لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ﴾ کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: ''تا کہ اسے عرب کے تمام ادیان پر غالب کر دے۔'' اور اپنے اس اضافے کو بغیر بریکٹس کے باضابطہ متن کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت میرے نزدیک نہ صرف بہت بڑی جسارت اور گمراہی ہے‘ بلکہ تحریف فی القرآن کے مساوی ہے۔ آپ ایک آیت کا جو مفہوم سمجھتے ہیں آپ کا حق ہے کہ اسے بیان کریں۔ اس کی بہترین شکل تو یہ ہے کہ آپ اپنی وضاحت حواشی میں بیان کریں۔ مزید اضافہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو بریکٹس میں کریں۔ جو چیز قرآن کے متن میں سرے سے موجود ہی نہیں‘ وہ آپ کا اپنا ذہن وفکر ہے‘ وہ ایک تأویل ہے جو آپ کے سامنے آئی ہے‘ اسے قرآن کے متن میں شامل کر دینا بہت بڑی زیادتی ہے۔

اس طرزِ عمل کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان کسی سبب سے کسی شے کی مخالفت پر کمر کس لے تو یہ چیز اسے اندھا بہرا بنا دیتی ہے۔ جیسے حضورﷺ نے فرمایا ہے: ((حُبُّکَ الشَّیْئَ یُعْمِیْ وَیُصِمُّ)) (ابوداوٗد و مسند احمد) ''تیرا کسی چیز سے محبت کرنا تجھے اندھا بہرا بنا دیتا ہے۔'' اسی طرح مخالفت‘ دشمنی اور بغض وعناد بھی انسان کو اندھا بہرا کر دیتا ہے۔ اِن آیات کے بارے میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کا موقف جو انہوں نے ''ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء'' میں بیان کیا ہے‘ میثاق (اپریل ۱۹۸۶ء) میں شائع کیا جا چکا ہے۔ کسی کو چند عربی اشعار ازبر ہوں اور جاہلی شاعری سے کچھ مناسبت ہو تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ شاہ ولی اللہؒ سے بھی آگے نکل گیا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ قرآن کی اس عبارت کی صرفی ونحوی ترکیب شاہ ولی اللہ کی نظروں سے بھی اوجھل رہی۔ یہی درحقیقت انسان کی طبیعت کا وہ نشوز ہے جس سے پھر فتنے جنم لیتے ہیں۔ اسی سے اُمت کے اندر طرح طرح کی گمراہیاں پیدا ہوئیں اور پھلی پھولیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ (آمین)

اس نشست میں مَیں اس آیۂ مبارکہ پر کچھ عرض نہیں کر رہا ہوں۔ اس پر میں ''نبیٔ اکرم ﷺ کا مقصد بعثت'' نامی کتابچے میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں اور مجھے اس پر پورا انشراح ہے۔ اس آیت کے جو مختلف ترجمے کیے گئے ہیں میں نے ان سب کو پیش نظر رکھا ہے اور لِیُظْهِرَهٗ کی ضمیر فاعلی اور ''ہٗ'' کی ضمیر مفعولی کے تمام امکانات کو زیر بحث لا کر یہ ثابت کیا ہے کہ کسی بھی طرح مراد میں قطعاً کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ لِیُظْهِرَ کا فاعل رسول ہو یا اللہ' نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے۔ ''تاکہ رسول غالب کر دے دین حق کو'' مفہوم لیا جائے یا ''تاکہ اللہ غالب کر دے اپنے دین کو'' اس سے نتیجے میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ فاعل حقیقی تو اللہ ہی ہے' لیکن اس کے لیے محنت انسان کو کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ مشقت محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے جھیلی ہے' فاقے آپؐ کو برداشت کرنے پڑے ہیں' شعب بنی ہاشم کی تین سال کی اسیری کے تمام شدائد و مصائب کا معاملہ حضور ﷺ کے ساتھ ہوا ہے۔ آپؐ کو اپنے جسم اطہر پر پتھراؤ برداشت کرنا پڑا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنی جانیں دینی پڑی ہیں' مگر فاعل حقیقی اللہ ہی ہے' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ (الانفال: ۱۷) عالمِ واقعہ میں تو حضور ﷺ نے مٹھی بھر کر کنکریاں پھینکی تھیں لیکن اللہ نے فرمایا کہ آپؐ نے نہیں' ہم نے پھینکی ہیں۔ گویا ع ''ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مؤمن کا ہاتھ!'' تو نتیجہ کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ رازقِ حقیقی یقیناً اللہ ہے' اگرچہ رزق کے لیے محنت و مشقت اور معاشی بھاگ دوڑ انسان کرتا ہے۔ اسی طرح ''اظهارُ دینِ الحقّ علی الدّینِ کُلِّہٖ'' کا فاعل حقیقی اللہ ہے جبکہ اس کے لیے محنت و مشقت کرنی پڑی ہے ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ'' کو — صلی اللہ علیہ وسلم و رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

کسی نے کہا کہ ہٗ کی ضمیر مفعولی حضور ﷺ کی طرف جاتی ہے ''تاکہ اللہ غالب کر دے اپنے رسول کو''۔ نتیجہ پھر بھی وہی آئے گا' اس لیے کہ رسولؐ کے غلبے کا مطلب دین ہی کا غلبہ تھا۔ رسولؐ نے کوئی اپنی سلطنت کی بنیاد نہیں رکھی' کوئی اپنے نام سے حکومت قائم نہیں کی' بلکہ رسول اللہ ﷺ کا معاملہ تو دوسری انتہا پر نظر آتا ہے کہ جب عام مسلمانوں کے گھروں میں بھی کشادگی و فراوانی آ چکی تھی' تنگی ختم ہو چکی تھی' اُس وقت بھی آپؐ نے اپنا چولہا ٹھنڈا رکھا ہے۔ جب تمام مسلمانوں کے ہاں خدام اور کنیزیں تھیں اُس وقت بھی اپنی لختِ جگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کوئی کنیز یا غلام عطا نہیں کیا۔ تو وہ غلبہ محمدؐ ﷺ کا اس معنی میں نہیں تھا کہ کسی شخصیت کا غلبہ تھا' بلکہ وہ دین کا غلبہ تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب حضرات میرے مقالے ''نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت'' کا مطالعہ ضرور کریں' تاکہ یہ جو فتنے اُٹھ رہے ہیں اور ہم نے اپنی اجتماعی جدوجہد کا جو ہدف معین کیا ہے ''اقامت دین'' اور ''اظهارُ دینِ الحقّ علی الدّینِ کُلِّہٖ'' اس کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں تو ہم کہیں لاعلمی میں اور اپنی کم فہمی کے باعث یا ان حقائق کے واضح نہ رہنے کے باعث کسی ایسی تحریک یا کوشش سے متاثر نہ ہو جائیں۔

سورۃ الصّف کی مرکزی آیت کا زیر مطالعہ آیت سے ربط و تعلق

اب اصل میں اس آیۂ مبارکہ کا سورۃ الفتح کی آخری آیت سے جو ربط و تعلق ہے اس درس میں اس پر گفتگو ہوگی۔ اقامت دین اور غلبۂ دین کی جو یہ جدوجہد ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿هُوَ الَّذِىْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ یہ جدوجہد کس نے کی؟ اور وہ لوگ کن اوصاف کے حامل تھے؟ یہ اس آخری آیت کا مضمون ہے اور ہمارے اِس منتخب نصاب نمبر۲ کے ساتھ منتخب نصاب نمبر ایک کا ربط اب یہاں سے قائم ہو رہا ہے۔

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ﴾ پہلے تو اس کی ترکیب کے بارے میں جو اختلاف ہے اس کو سمجھ لیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' ایک مکمل جملہ ہے اور ''وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ'' سے ایک جملہ مستانفہ شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی یہاں سے ایک نئی بات کا آغاز ہو رہا ہے اور اس جملے کا سابقہ جملے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ اس صورت میں ترجمہ ہوگا: ''محمد اللہ کے رسول ہیں''۔ یہ جملہ اسمیہ خبریہ ہے۔ ''محمد'' مبتدأ اور ''رسول اللہ'' مضاف' مضاف الیہ مل کر خبر ہو گئی' جملہ کامل ہو گیا۔ اگلے الفاظ سے نیا جملہ شروع ہوگا: ''اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں......'' دوسری رائے کی رو سے ترجمہ ہوگا: ''اللہ کے رسول محمدؐ اور وہ لوگ جو اُن کے ساتھ ہیں''۔ معطوف اور معطوف علیہ جمع ہو کر مبتدا بنیں گے' جبکہ خبر بعد میں آئے گی اور وہ ہے ''اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ''۔ خبر اوّل ہوگی ''اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ'' اور خبر دوم ہوگی ''رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ'' اور یہ سلسلہ آگے چلے گا۔ تو یہ پورا معاملہ خبر کا ہو جائے گا۔ یعنی اللہ کے رسول محمد (ﷺ) اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں ان کے یہ یہ اوصاف ہیں۔

اگر پہلی رائے قبول کی جائے تو یوں بات ہوگی کہ جہاں تک تعلق ہے محمد ﷺ کا وہ تو اللہ کے رسول ہیں ہی۔ گویا کہ وہ تو تمام کمال و محاسن کے جامع ہیں' ان کے بارے میں تو کچھ کہنے کی احتیاج ہے ہی نہیں' آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ ان کے خصائص' اوصاف' محاسن اور کمالات از خود روشن ہیں۔ مزید اُن کے کسی ذکر کی حاجت نہیں' صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ''محمد اللہ کے رسول ہیں''۔ جیسے ہم اپنے محاورے میں کہتے ہیں ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں''۔ تو گویا کہ ایک جملے میں وہ ساری بات آ گئی اور جتنی بھی ان کی مدح ہو سکتی تھی وہ اس میں ہو گئی کہ ''محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔'' اب اس پر مزید کسی اور شے کے اضافے کی کوئی احتیاج نہیں۔ اب جو اوصاف بیان ہو رہے ہیں ان کے حامل حضور ﷺ کے ساتھی ہیں۔ یہ آپؐ کی جماعت کے افراد کے اوصاف ہیں جن کو یہاں پر بیان کیا جا رہا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب تمام کمال و محاسن محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی

ذاتِ گرامی میں جمع ہیں تو یہ اوصاف بھی بدرجۂ اتم' بدرجۂ کمال آپ کے اندر بھی موجود ہیں۔ اس اعتبار سے اگر ان دونوں کو مبتدأ بنا لیا جائے تو خبر میں بھی دونوں شریک ہو جائیں گے' لیکن ہمارے لیے عملی اعتبار سے جو اہم تر پہلو ہے وہ آگے ہے کہ جو حضور ﷺ کے ساتھی ہیں اُن کے اوصاف کیا ہیں!

اسلامی انقلابی جماعت کی ہیئت ترکیبی

آگے بڑھنے سے پہلے نوٹ کیجیے کہ یہاں اقامت دین کے لیے قائم ہونے والی جماعت کی ہیئت ترکیبی کی طرف بھی ایک اشارہ موجود ہے۔ اس کا تعلق سورۃ الصّف کی آخری آیت سے جڑتا ہے کہ وہ جمعیت اس طور سے فراہم ہوتی ہے کہ کوئی داعی پکارتا ہے: ''مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ؟'' اور دوسرے اس پکار پر لبیک کہتے ہوئے یہ اقرار کرتے ہیں: ''نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ!'' یہ اس جماعت کی ترکیب اور اس کا synthesis ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ پہلے داعیانِ حق انبیاء و رُسل تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ''مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ'' کی ندا لگائی ﴿کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ ط قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ﴾ اب یہاں اُس کو بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آج یہ کام محمدٌ رسول اللہ ﷺ کر رہے ہیں۔ وہ اللہ کے رسول ہیں' دین کو غالب کرنا اصلاً ان کا فرضِ منصبی ہے۔ جیسے دین کی تبلیغ اصلاً ان کا فرضِ منصبی ہے' اُمتی جو بھی اس میں حصّہ لے رہا ہے وہ آپؐ کی جانب سے (on his behalf) لے رہا ہے اور اس کام میں آپؐ کا مددگار بنا ہے۔ آپؐ کے سب ساتھی اس ذمہ داری کی ادائیگی میں آپؐ کے اعوان و انصار بنے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں مَیں نے بارہا عرض کیا ہے کہ حضور ﷺ پر ایمان لانے کے بعد وہ اس پیغام کو آگے پہنچانے پر جس طرح کمر بستہ ہوئے اس کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ عشرۂ مبشرہ میں سے چھ وہ ہیں جو حضرت ابوبکرؓ کی دعوت و تبلیغ سے اسلام لائے۔ لیکن یہ ذمہ داری اصلاً محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی ہے جبکہ آپؐ کے ساتھی درحقیقت آپؐ کی جانب سے اس فرض کو ادا کر رہے ہیں۔ اسی طرح غلبۂ دین کی ذمہ داری اصلاً تو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی ہے اور جو حضرات بھی آپؐ کے ساتھ آئے ہیں ﴿وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ﴾ وہ آپؐ کے اعوان و انصار ہیں' آپؐ کے مددگار ہیں' آپؐ کے دست و بازو بنے ہیں۔

اس جماعت میں حضور ﷺ کی ایک تو وہ حیثیت ہے کہ جو تمام حیثیتوں سے بالاتر ہے۔ یعنی آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ لیکن اب یہاں ایک اور نسبت قائم ہو گئی اور وہ امیر اور مأمور کی نسبت ہے۔ انفرادی طور پر نبی اکرم ﷺ کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بہت سی نسبتیں قائم ہوئیں۔ جیسے حضور ﷺ کے ساتھ ایک نسبت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ہے' یہ شوہر اور بیوی کی نسبت ہے۔ ایک نسبت آپؐ کی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ہے' یہ داماد اور خسر کی نسبت ہے۔ مختلف نسبتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہیں' داماد اور خسر کی نسبت بھی ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی آپؐ کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو نسبتیں قائم ہوئیں وہ یہ ہیں کہ حضور ﷺ امیر ہیں اور تمام صحابہؓ مأمور ہیں' حضور ﷺ حاکم ہیں اور باقی سب لوگ آپؐ کا حکم تسلیم کر رہے ہیں' حضور ﷺ اس ریاست کے چیف جسٹس ہیں' اور تمام صحابہؓ اپنے نزاعات آپؐ کے حضور پیش کرتے ہیں۔ اگر دو مسلمان کوئی مقدمہ لے کر آپ ﷺ کی عدالت میں پیش ہوئے ہیں تو اس وقت ان دونوں کی آپس میں نسبت مدعی اور مدعا علیہ کی ہے' جبکہ دونوں کے لیے منصف' جج اور قاضی کی حیثیت آپؐ کی ہے۔ تو یہ اضافی نسبتیں تھیں جو آپ ﷺ کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ قائم ہوئیں۔ اسی طرح ایک نسبت اس جماعت میں امیر اور مامور کی ہے جو آپؐ اور صحابہؓ کے مابین قائم ہوئی۔ لیکن یہ کہ اس کا اصل synthesis یہ ہے: ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ''۔ اور اس کا ربط پھر ذہن میں قائم کر لیجیے ''مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ؟'' اور ''نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ'' کے ساتھ۔

اقامت دین کی جدوجہد کے لیے آئندہ جو بھی جماعت قائم ہو گی اس کے لیے بنیاد ہمیں قرآن و سنت ہی سے اخذ کرنی ہے۔ اس لیے کہ ہمیں اتباع تو آپؐ ہی کا کرنا ہے' پیروی آپؐ ہی کی کرنی ہے' اور حتی الامکان زیادہ سے زیادہ جتنی پیروی کی جا سکے کرنی ہے۔ البتہ ایک بات بالکل واضح ہے کہ اب جو کوئی بھی اس جدوجہد کے لیے کھڑا ہو گا وہ داعی تو ہو گا نبی نہیں ہو گا۔ اس حیثیت کو ہمیشہ ذہن میں رکھا جائے۔ وہ سلسلہ آپؐ پر ختم ہو چکا ہے۔ حضور ﷺ کسی غزوہ کے لیے تشریف لے جا رہے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپؐ نے اپنے نائب یا خلیفہ کے طور پر مدینے میں مقیم رہنے کا حکم دیا۔ اب جنگ پیش آ رہی ہو' صحابہ رضی اللہ عنہم شرکت کے لیے جا رہے ہوں' جان کی بازی لگانے کا موقع مل رہا ہو اور حضرت علیؓ مدینہ میں رہیں' یہ بات آپؓ کے مزاج سے مطابقت نہ رکھتی تھی۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے حضور ﷺ سے شکوہ کیا کہ آپؐ مجھے یہاں خواتین کے ساتھ چھوڑ کر جا رہے ہیں! اس پر آپ ﷺ نے دلجوئی کے لیے فرمایا کہ کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ تمہاری میرے ساتھ وہی نسبت ہو جو موسیٰؑ کے ساتھ ہارونؑ کی تھی؟ سوائے اس فرق کے کہ نبوت مجھ پر ختم ہو چکی ہے' وحی کا معاملہ بند ہو چکا ہے۔ یعنی اس تشبیہ سے کہیں یہ مغالطہ نہ ہو جائے کہ حضرت علیؓ حضرت ہارونؑ کی طرح نبی بھی ہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے ساتھ ہی یہ صراحت فرما دی کہ مبادا لوگ اس کو حضرت علیؓ کی نبوت کے لیے دلیل بنا لیں۔ اگرچہ لوگوں نے تو حضرت علیؓ کو خدا تک بنا لیا' لیکن اگر حضور ﷺ نے یہ صراحت نہ فرمائی ہوتی تو کچھ لوگوں کے لیے اس کا امکان بھی پیدا ہو جاتا کہ اس قولِ رسولؐ کی بنیاد پر ان کی نبوت ثابت کر دیں۔ چنانچہ ایک بات ہمیشہ مستحضر رہنی چاہیے کہ معصومیت ختم ہو چکی' وحی کا دروازہ بند ہو چکا' نبوت کا سلسلہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر ختم ہو چکا۔ البتہ اقامت دین کے لیے جو جماعت یا تنظیم قائم ہو گی اس کے لیے اگر وہی مسنون نسبت قائم نہ کی گئی تو وہ ''علٰی منہاج النبوۃ'' نہیں ہو گی' وہ حضور ﷺ کے نقشِ قدم پر نہیں ہو گی اور اس کا خاکہ ہم نے گویا کہیں اور سے مستعار لیا ہو گا۔ جبکہ ہمیں ہر چیز کے اندر رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنی

ہے۔ اتباعِ رسولؐ صرف عبادات میں ہی نہیں ہے بلکہ پوری زندگی میں ہے۔ اقامت دین کی جدوجہد جو کہ دین کی بلند ترین منزل ہے' اس کے لیے بھی سارا نقشہ وہیں سے لینا ہے۔ لیکن یہ فرق ہمیشہ ملحوظ رہے کہ اگر کہیں کسی شخصیت کے بارے میں کوئی مبالغہ' کسی کے بارے میں عقیدت میں کوئی غلو یا کسی کے آداب کو ملحوظ رکھنے میں حدِّ اعتدال سے تجاوز ہو جائے گا تو شخصیت پرستی کی بنیاد پڑ جائے گی اور اس طرح ایک نیا فتنہ شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ اس احتیاط کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ہمیں باقی pattern وہیں سے لینا ہے' سارا نقشہ وہیں سے اخذ کرنا ہے۔

اقامت دین کی جدوجہد کے لیے قائم ہونے والی جماعت کی نوعیت کے ضمن میں ہمیں قرآن وسنت سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ کوئی ایک شخص داعی کی حیثیت سے اٹھتا ہے اور وہ ایک کام کا بیڑا اٹھاتا ہے' اللہ اس کو ہمت دیتا ہے اور اس کے اندر ایک جذبہ ابھارتا ہے۔ اس لیے کہ ہر چیز کا فاعلِ حقیقی اور مؤثرِ حقیقی تو اللہ ہی ہے۔ کسی کے دل میں اگر ارادہ پیدا ہوا ہے تو وہ بھی اللہ کا عطا کردہ ہے۔ پھر یہ کہ ایک تو منزل ہے جس کا قصد کیا جا رہا ہے کہ جانا کہاں ہے اور ایک یہ کہ وہ طریق' وہ راستہ کون سا ہے جو ہمیں اس منزل تک پہنچائے گا۔ ان دونوں چیزوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ اگر کسی کو انشراح عطا فرماتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ ''جا ایں جاست'' بات یہی ہے' حق یہ ہے' تو اس کو جو انشراح ہوا ہے وہی کچھ ذہنوں اور کچھ سینوں کے اندر منتقل ہوگا اور وہ لوگ اب اس کے دست و بازو بنیں گے' اس کی پکار پر لبیک کہیں گے' اس کے ساتھ جڑیں گے۔ ''جوڑ'' اور ''جڑنا'' کے الفاظ ہمارے تبلیغی بھائی بالکل صحیح معنیٰ میں استعمال کرتے ہیں۔ اب اس ایک فرد کے ساتھ دوسرے افراد کے جڑنے سے اس کے گرد دائرے بنتے چلے جائیں گے۔ پہلے چار چھ آدمی آئے' پھر اس کے بعد اور بڑھے' پھر اور بڑھے۔

یہ ہے اصل میں وہ فطری ترتیب جو ہمیں انبیاء ورُسل کی دعوت میں ملتی ہے' جبکہ اس کے برعکس اِس دور کا تصور یہ ہے کہ کچھ لوگ مل جل کر ایک جماعت بنائیں۔ ہمارے ہاں انجمنیں اسی طرح بنتی ہیں۔ انجمنوں کے لیے کوئی داعی نہیں ہوا کرتا' بلکہ کوئی وقت کا تقاضا ہوتا ہے' کوئی ایک وقتی ضرورت ہوتی ہے جس کے تحت انجمن ظہور میں آجاتی ہے۔ انگریز کے زمانے میں محسوس کیا گیا کہ ہندو تعلیم میں ہم سے آگے نکل گیا ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں تو اختلافِ رائے ہو گیا تھا' ہمارے علمائے کرام نے انگریزی پڑھنے کو اور انگریزی علوم حاصل کرنے کو شجرِ ممنوعہ قرار دیا تھا' لہٰذا مسلمان پیچھے رہ گئے اور ہندو اس دوڑ میں آگے نکل گئے' انگریز کے دربار میں انہیں رسائی حاصل ہوگئی۔ اُس وقت ہر اعتبار سے محسوس ہونے لگا کہ اگر تعلیم کے میدان میں مسلمان کا یہی حال رہا تو پھر وہ صرف پلے دار یا بہشتی بن سکیں گے اور معاشرے کے اندر بالکل پسماندہ ہو کر رہ جائیں گے۔ چنانچہ اجتماعی سطح پر ایک جذبہ ابھرا اور پیش نظر تقاضے کی بنیاد پر کچھ لوگوں نے ''انجمن حمایت اسلام'' بنالی جس کے تحت تعلیمی ادارے قائم کیے گئے۔ اسی طرح کئی اور انجمنیں قائم ہوئیں' کسی کے تحت کوئی ہائی سکول قائم ہوگیا' کسی کے تحت کوئی کالج بن گیا' کوئی کالج بن کر یونیورسٹی کے درجے کو پہنچ گیا۔ وہ درحقیقت ایک جذبہ تھا' وقت کی ایک ضرورت تھی جسے بہت سے لوگوں نے بیک وقت محسوس کیا اور بہت سے لوگوں نے مل جل کر اپنے آپ کو ایک انجمن کی صورت میں منظم کرلیا۔ اس میں کسی فردِ واحد کی دعوت' اس کا فکر' اس کا انشراح' اس کا پکار بلند کرنا اصلاً فیصلہ کن نہیں تھا۔ تو انجمنیں بھی بلاشبہ ایک طرح کی ہیئت تنظیمی ہوتی ہیں' ان میں سب لوگ مساوی حیثیت سے شریک ہوتے ہیں' پھر ووٹ کی بنیاد پر کسی کو صدر بناتے ہیں' ووٹ کی بنیاد پر مجلس منتظمہ معین کرتے ہیں اور ان کے مابین حدود واختیارات اور حقوق میں توازن پیدا کیا جاتا ہے' اس طرح یہ گاڑی چلتی ہے۔

لیکن اقامت دین کی جدوجہد کے لیے قائم جماعت کی ہیئت تشکیلی یہ نہیں ہے' بلکہ اس میں اصل معاملہ داعی ومدعو کا ہے' یعنی ''مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ'' کی ندا لگانے والے کا اور جو اُس کی ندا پر لبیک کہے اس کا ہے۔ وہ شخص کہ جو آگے بڑھا ہے' جس نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور وہ لوگ کہ جو اس کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اس کے ساتھی بنے ہیں اُن کے آپس میں جڑنے سے وہ جماعت وجود میں آتی ہے۔ تو یہ ایک اہم نکتہ ہے جو قرآن کے ان دو مقامات کے حوالے سے پوری طرح واضح ہو کر ذہن نشین رہنا چاہیے۔ ایک سورۃ الصّف کی آخری آیت: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ط قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ﴾ اور دوسری سورۃ الفتح کی زیرنظر آیت: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ﴾ اس جماعت کی جو تشکیل ہوئی ہے' اس کی جو ہیئت ترکیبی ہے وہ یہی ہے کہ ''محمد اللہ کے رسول اور وہ لوگ جو اُن کے ساتھ ہیں'' جنہوں نے آپؐ کی پکار پر لبیک کہا ہے اور حاضر ہو گئے ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا وصفِ اوّل

ان کا پہلا وصف یہ ہے: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ﴾ ''کفار پر بہت سخت اور آپس میں رحم دل ہیں۔'' ظاہر ہے کہ جب وہ ایک ہیئت اجتماعی میں شریک ہو گئے تو اب ایک تفریق ہوئی ہے۔ ایک وہ ہیں جو اس ہیئت اجتماعیہ میں شامل ہیں اور ایک وہ ہیں جو شامل نہیں ہیں' تو ان میں حدّ فاصل قائم ہوگئی۔ پھر یہ کہ جو آ گئے ہیں ان میں بھی حفظِ مراتب ہوگا' سب برابر تو نہیں ہوتے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اپنا مقام ومرتبہ ہے' عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اپنا مقام ومرتبہ ہے' ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است! صحابہؓ کے اندر تفضیل تو ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں انبیاء ورُسل کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ﴾ ''یہ وہ رسول ہیں کہ بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت

دی''۔اسی طرح صحابہ ؓ میں بھی بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ ہمارے ہاں اہل سنت کے نزدیک یہ بات متفق علیہ ہے کہ بالکل چوٹی پر تو چار خلفائے اربعہ ہیں اور ان میں جو ترتیب خلافت ہے یہی ترتیب فضیلت ہے کہ خلیفۂ اوّل تمام صحابہؓ میں افضل ہیں' پھر خلیفۂ ثانی' پھر خلیفۂ ثالث اور پھر خلیفۂ رابع۔اس کے بعد پھر چھ حضرات عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں۔ان کے بعد پھر نیچے اتریں گے تو ۳۱۳ اصحابِ بدر ہیں۔ پھر ذرا اور نیچے اتریں تو ۱۴۰۰ یا ۱۸۰۰ اصحابِ بیعت رضوان ہیں۔اس سے پھر ایک سیڑھی نیچے اتریں تو وہ سب لوگ جو فتح سے پہلے ایمان لائے۔(فتح سے مراد صلح حدیبیہ ہے یا فتح مکہ' اس میں اختلاف ہے)اور پھر اس کے بعد وہ سب صحابہؓ جو فتح کے بعد ایمان لائے۔اس کے لیے سورۃ الحدید میں نص بھی موجود ہے:

﴿لَا يَسْتَوِيْ مِنكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ط اُولٰئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ط﴾

''تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے۔ان کا درجہ بہر حال بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے۔''

تو یہ فرقِ مراتب اور حفظِ مراتب ان میں بھی ہے کہ جو''اَلَّذِيْنَ مَعَهٗ'' میں شامل ہیں۔وہ اس جماعت کے افراد ہیں' سب محمدﷺ کے ساتھی ہیں' ان کے لیے علیحدہ علیحدہ کوئی نام بھی نہیں رکھے گئے' ان میں قانون کے درجے میں کوئی درجہ بندی نہیں تھی' جو اپنے جذبہ سے جتنا قریب آ گیا' جس نے جتنی محنت کی' جس نے جتنی قربانیاں دیں' جس نے جتنا زیادہ وقت صرف کیا' جس نے اپنے آپ کو جتنا چمٹا لیا محمدﷺ سے اتنا ہی وہ قریب ہوتا چلا گیا اور اتنا ہی پھر حضورﷺ مشوروں میں ان پر زیادہ اعتماد فرمانے لگے۔حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے''قـــرۃ العینین فی تفضیل الشیخین'' میں رسول اللہﷺ کے بہت سے اقوال نقل فرمائے ہیں کہ آپؐ کے کلامِ مبارک میں یہ انداز بکثرت ملے گا: ((جِئْتُ اَنَا وَاَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ)) ''میں آیا اور ابوبکرؓ آئے اور عمرؓ آئے۔'' اسی طرح ((ذَهَبْتُ اَنَا وَاَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ)) ''میںؐ بھی گیا تھا اور ابوبکرؓ اور عمرؓ بھی۔'' چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو دو حضرات ہیں''صاحبین'' یہ تو گویا ہر وقت سائے کی طرح حضورﷺ کے ساتھ ہوتے تھے اور جب بھی کوئی مشورہ ہوتا تو اوّلیت انہی کو حاصل ہوتی۔اسی طرح ایک فطری ترتیب تو وہاں قائم تھی' لیکن کوئی قانونی ترتیب قائم نہیں کی گئی۔ بہر حال ایک حد بندی تو یہ ہوگئی کہ جو آپؐ کے ساتھ نہیں ہیں وہ علیحدہ ہیں اور جو ساتھ ہیں وہ علیحدہ۔

پھر جس طرح ان ساتھ والوں میں درجہ بندی اور حفظ مراتب ہے اسی طرح''نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد'' کے مصداق جو آپؐ کی جماعت میں شامل نہیں' جو باہر ہیں وہ بھی سب برابر نہیں ہیں۔ باہر تو ابو طالب اور مطعم بن عدی بھی ہیں' لیکن دونوں شریف لوگ ہیں' حضورﷺ کی مخالفت نہیں کر رہے' بلکہ تعاون ہی کر رہے ہیں۔وہ لوگ بھی ابھی ساتھ نہیں آئے تھے کہ جو شعب بنی ہاشم میں پہاڑ کی چوٹی کو عبور کر کے رات کے وقت جا کر کچھ کھانے پینے کا سامان پہنچاتے تھے۔ان میں حکیم بن حزامؓ ہیں جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔تو جو باہر ہیں ان میں بھی درجہ بندی ہوگی۔ایک وہ ہیں جو ساتھ تو نہیں ہیں لیکن معاند اور مخالف بھی نہیں ہیں' دشمن نہیں ہیں' ایذا پر کمر بستہ نہیں ہیں اور ایک وہ ہیں کہ جو مخالفت میں پیش پیش ہیں۔اب ان میں بھی ہر ایک کا الگ درجہ ہوگا۔کسی میں رسول اللہﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں سے عناد' بغض اور دشمنی آخری درجے کو پہنچی ہوئی ہے' جیسے ابو جہل اور ابولہب ہیں' چاہے وہ انتہائی قریبی رشتہ دار ہیں۔ابو جہل کا قبیلہ ایک ہے مگر گھرانہ ایک نہیں ہے' لیکن ابولہب کا تو قبیلہ' گھرانہ اور خاندان وہی ہے۔اس کا حضورﷺ کے ساتھ چچا اور بھتیجے کا رشتہ ہے۔لیکن جس طرح ابو جہل دشمن ہے اتنا ہی ابولہب بھی ہے۔تو یہ درجہ بندی بھی ذہن میں رکھیں۔اور اسی کے اعتبار سے اب نسبت بدل جائے گی۔پہلی چیز جو اِس اجتماعیت کی تقویت کے لیے لازم ہے وہ یہ کہ دلی تعلق کا معیار اب اسی کے مطابق ڈھل جائے۔ جو اجتماعیت ایک مقصد کے تحت وجود میں آئی ہے اس مقصد کے ساتھ جتنی گہری وابستگی (commitment) اور جتنا گہرا دلی تعلق ہے اس کا ظہور ہونا چاہیے۔اس مقصد کے حوالے سے جو لوگوں میں تقسیم ہوئی ہے اور درجہ بندی ہوئی ہے اس کا عکس اگر اس جماعت میں نظر آئے تب تو درحقیقت ظاہر و باطن اور قول وعمل میں ہم آہنگی ہے۔اور اگر ایسا نہیں ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کی اس مقصد کے ساتھ وابستگی صحیح نہیں ہے۔آپ دعویٰ ضرور کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں وہ مقصد آپ کے احساسات میں جذب نہیں ہوا' ورنہ جس کو یہ مقصد جتنا عزیز ہوا اتنا ہی وہ آپ کو عزیز اور محبوب ہونا چاہیے اور جو اس مقصد سے جتنا دور ہے وہ اتنا ہی آپ کے دل سے دور ہونا چاہیے۔

اس ضمن میں یہ بات ذہن میں رکھئے کہ ایک ہمارا ظاہری برتاؤ ہے' اس میں قانون کا معاملہ ہوگا' کون باپ ہے' کون ماں ہے' کون دوسرے درجہ پر ہمارا عزیز ہے اور اس کے کیا حقوق ہیں۔جیسا کہ والدین کے معاملے میں فرمایا کہ وہ تمہیں شرک پر مجبور کر رہے ہوں تو تمہیں ان کا کہنا نہیں ماننا' لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہ اُن کے سارے حقوق ساقط ہو جائیں گے' بلکہ ان کے ساتھ حسن سلوک اسی طرح برقرار رہے گا ﴿وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا﴾۔اسی طرح بھائیوں کا یا دوسرے رشتہ داروں کا معاملہ ہے کہ ان کے جو بھی حقوق ہیں وہ ادا کیے جائیں۔خاص طور پر جب معاملہ مسلمانوں کے مابین آ جائے گا تو جو بھی مسلمان کے قانونی حقوق ہیں وہ ادا کرنے ہوں گے۔اور پھر شریعت میں

قرابت دار مسلمان کا حق فائق ہے' وہ جوں کا توں قائم رہے گا۔لیکن ایک دلی تعلق ہوتا ہے'اس کے مستحق وہ ہیں جو آپ کے ہم مقصد ساتھی ہیں۔اگر تمہارا قلبی میلان ان لوگوں کی طرف ہے جو اس مقصد میں تمہارے ساتھی نہیں ہیں' جو اس سفر میں تمہارے ہم سفر نہیں ہیں' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پر اس سفر کی قدر و قیمت ہی منکشف نہیں ہوئی' اس کی حیثیت کو تم نے جانا ہی نہیں۔جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: ﴿مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ط﴾ (الحج:٧٤) ''انہوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسا کہ اس کی قدر کرنی چاہیے۔'' اللہ کا اندازہ نہ کیا جیسا کہ اندازہ کرنا چاہیے۔

اس سارے معاملے کا دار و مدار ہمارے value system پر ہوتا ہے کہ کس چیز کی آپ کی نگاہ میں قدر و منزلت ہے' اسی کے اعتبار سے آپ کا رویہ طے پائے گا۔ اگر آپ نے اس کام کی قدر کو سمجھا ہے تو پھر ان لوگوں کی قدر و منزلت آپ کی نگاہ میں ہوگی اور ان سے محبت ہوگی جو آپ کے اس کام میں شریک ہیں' آپ کے دست و بازو ہیں' آپ کے ساتھ لگے ہوئے ہیں' جن کو آپ 'رفیق' کا مرید' colleague ' ہم سفر اور ہم مقصد ساتھی کہتے ہیں' اور آپ کی محبت ان کے ساتھ نہیں ہوگی جو آپ کے ساتھ نہیں ہیں' جو اس مقصد کے دشمن ہیں' جو اس کے ساتھ بغض وعناد رکھتے ہیں' جو اس کے راستے میں روڑے اٹکاتے ہیں' اب ان کے ساتھ تو کسی درجے میں مودّت کا معاملہ بھی نہیں رہے گا' بلکہ حقیقت کے اعتبار سے ان کے ساتھ بالقوۃ (potentially) دشمنی کی نسبت قائم ہوگی۔اس لیے کہ دوستی اور دشمنی کا معیار تو اللہ تعالیٰ ہے۔چنانچہ جو اللہ کا دشمن ہے وہ ہمارا دشمن ہے' جو اللہ کے دین کا دشمن ہے وہ ہمارا دشمن ہے' چاہے وہ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتا ہو' چاہے وہ ہمارا بھائی یا بیٹا ہو' خواہ وہ ہمارے عزیز رشتہ دار ہوں۔تو جہاں تک وہ لوگ ہیں کہ جو مخالفت پر کمر کس چکے ہوں ان کے باب میں ''اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ '' کا معاملہ ہوگا۔یعنی بہت بھاری ہیں ان پر جو انکار کرنے والے ہیں' معاند ہیں۔

یہ وضاحت اس لیے کر رہا ہوں کہ سورۃ الـمُـمتحـنة میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان غیر مسلموں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے نہیں روکتا کہ جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمہیں گھروں سے نہیں نکالا' انہوں نے تمہارے خلاف کوئی جتھا بندی نہیں کی' ان کے ساتھ حسن سلوک ہو تو کوئی حرج نہیں۔البتہ جن سے تمہیں شدت کے ساتھ روکتا ہے ان کی دوستی اور محبت سے باز آ جانا ایمان کا لازمی و بنیادی تقاضا ہے' اگر اس کو بھی پورا نہیں کرتے تو اصل میں تمہارا ایمان مشکوک ہو جائے گا۔تو ان لوگوں کے ساتھ محبت' اخوت اور دوستی کا کوئی رشتہ برقرار رہنا ایمان کے منافی ہے کہ جو دین کے خلاف جتھا بندی اور محاذ آرائی کر رہے ہیں' جو جنگ میں تمہارے مدّ مقابل بن کر آئے ہیں۔اب اس بنا پر کہ تمہارے ان سے خاندانی روابط تھے' یا تم کبھی ان کے حلیف رہے ہو' یا ان سے کوئی خونی رشتہ ہے' ان سے تمہاری محبت قائم رہی تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ تمہاری محبت سچی نہیں ہے۔تو یہ فرق و تفاوت قرآن نے کیا ہے۔یہاں چونکہ اجمال ہے اس لیے وہ فرق یہاں بیان نہیں ہوا تو میں نے مناسب سمجھا کہ اس کو دوسرے مقام کے حوالے سے کھول کر بیان کر دوں کہ یہ صفات ایک دوسرے کا عکس ہیں: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ کہ جو بھی مخالفین و معاندین ہیں ان پر بہت بھاری ہیں اور جو اپنے شریک سفر' ہم مقصد ساتھی ہیں ان کے لیے بہت نرم ہیں۔

بھاری یا سخت ہونے کا مطلب یہ نہ سمجھئے کہ ہر وقت ان کے درپئے آزار رہنا اور ہر وقت ان کی جڑ کاٹتے رہنا۔بھاری ہونا اس معنی میں ہے کہ وہ یہ محسوس کریں کہ یہ لوگ اپنے موقف پر بہت سخت ہیں' ڈٹے ہوئے ہیں' ان کو ہلانا آسان نہیں ہے۔مخالفین و معاندین ایسے محسوس کریں جیسے ہم محاورے میں کہتے ہیں کہ ان میں تو انگلی دھنسانے کا کوئی موقع نہیں ہے' یہ نرم چارہ نہیں ہیں کہ جدھر ہم چاہیں انہیں موڑ لیں' ذرا سی کچھ خاطر مدارات کر کے ان کو اپنی طرف راغب کر لیں' ان کی ذرا سی تالیف قلب کریں اور انہیں اپنے مقصد سے منحرف کر دیں۔نہیں' یہ بہت بھاری ہیں' چٹان کی مانند اپنی جگہ ڈٹے ہوئے ہیں' جس طرح کوہِ ہمالہ کو ہلانا ممکن نہیں ایسے ہی ان کو ہلانا بھی ممکن نہیں۔جبکہ آپس میں یہ بہت رحیم اور شفیق ہیں۔ان کا اپنا کوئی ساتھی آ کر اگر اپنی کوئی ضرورت بیان کرتا ہے تو ﴿يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ط﴾ (الحشر:٩) کے مصداق وہ اسے خود اپنی ذات پر ترجیح دیں گے' چاہے خود تنگی میں ہوں' خود اس شے کی زیادہ احتیاج رکھتے ہوں' لیکن وہ اپنے بھائیوں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھیں گے۔یہ ہے ان کا باہم مہربان ہونا' رحیم ہونا' شفیق ہونا۔اور اصل میں رفیق کا بنیادی مفہوم یہی ہے۔رفق کہتے ہیں دل کی نرمی کو۔حدیث شریف میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: ((مَنْ يُحْرَمِ الرِّفْقَ يُحْرَمِ الْخَيْرَ))[1] ''جو شخص دل کی نرمی سے محروم ہو گیا وہ (کُل کے کُل) خیر سے محروم ہو گیا''۔

(١) صحيح مسلم' كتاب البر والصلة والآداب' باب فضل الرفق۔

رفیق اصل میں وہی کہلائیں گے جو باہم ایک دوسرے کے لیے نرم ہوں' جن کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نرم گوشے ہوں' جو ایک دوسرے کی تکلیف پر تڑپ اٹھیں' ایک دوسرے کے درد کو اپنے اندر محسوس کریں۔تو یہ پہلا وصف ہے اس جماعت کے ''رفقاء'' کا جو اقامت دین کی کٹھن وادیوں میں قدم رکھنے کی تیاری کر رہی ہو' جو اس آیۂ مبارکہ کے حوالے سے ہمارے سامنے آیا ہے۔

تواصی بالحق اور اس کی بلند ترین منزل

ہمارے منتخب نصاب نمبر ایک کا حصّہ چہارم تواصی بالحق اور حصّہ پنجم تواصی بالصبر سے متعلق مباحث پر مشتمل ہے۔ان دونوں حصّوں کے درمیان ایک خلا تھا جو اِس منتخب نصاب نمبر۲ کے ذریعے پُر ہو رہا ہے۔اس لیے کہ تواصی بالحق کے ضمن میں مَیں یہ بات عام طور پر بیان کیا کرتا ہوں کہ حق کا لفظ بہت وسیع ہے۔حق چھوٹا بھی ہے اور حق بڑا بھی ہے۔کسی نے کسی کے پانچ روپے دینے ہوں اور وہ نہ دے رہا ہو اور آپ جا کر تلقین کریں کہ بھائی وہ پانچ روپے جو تمہارے ذمہ ہیں ادا کرو‘ تو یہ بھی تواصی بالحق ہے۔کوئی بچہ گلی میں کھیل رہا ہو‘ جو کہ اصلاً کھیلنے کی جگہ نہیں ہے‘ اور اس سے گزرنے والوں کے لیے تکلیف کا اندیشہ ہو تو اس بچے کو یہ سمجھانا کہ بیٹا یہاں مت کھیلو‘ یہ بھی تواصی بالحق ہے۔کوئی نوجوان اپنے والدین کے حقوق ادا نہ کر رہا ہو تو اسے یہ تلقین کرنا کہ اپنے والدین کے حقوق پہچانو اور ادا کرو‘ یہ بھی تواصی بالحق ہے۔لیکن سب سے بڑا حق یہ ہے کہ یہ زمین اللہ کی ہے‘ اس پر اسی کا حکم چلنا چاہیے‘ جائز حکمران صرف وہ ہے ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی ‘ باقی بتانِ آزری!

اب اس حق کا اعلان کرنا اور پھر اس حق کو فی الواقع بروئے کار لے آنا کہ ’’حق بحق دار رسید‘‘ کا معاملہ ہو جائے‘ جسے احقاقِ حق کہا جائے گا‘ یہ تواصی بالحق کی سب سے اونچی منزل ہے اور یہی بندۂ مؤمن کے فرائض دینی کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔اس کو ہم ’’تکبیر ربّ‘‘ سے بھی موسوم کرتے ہیں اور اقامت دین سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔اس کو ’اظھــارُ دیــنِ الحقّ علی الدّینِ کُلِّہٖ ‘‘ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور اس کے لیے قرآن میں ’’وَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ ‘‘ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔یہی وہ منزل ہے جسے آنحضورﷺ نے اعلائے کلمۃ اللہ سے تعبیر فرمایا ہے۔گویا بات ایک ہی ہے۔

آیۂ مبارکہ ﴿ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ﴾ قرآن حکیم میں تین مقامات پر آئی ہے۔سورۃ التوبۃ (آیت ۳۳) اور سورۃ الصّف (آیت ۹) میں آیت کا اختتام ﴿وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ﴾ کے الفاظ پر ہوتا ہے‘ جبکہ سورۃ الفتح میں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا﴾ ’’اور اللہ کافی ہے بطورِ گواہ‘‘۔اس سے ایک اضافی بات سامنے آتی ہے۔اگرچہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ’’لِیُظْھِرَہٗ‘‘ میں ضمیر فاعلی اور ضمیر مفعولی کے جتنے ممکنہ مراجع ہو سکتے ہیں ان سب کو پیش نظر رکھنے کے باوجود مراد اور معنیٰ میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا‘ لیکن اس آیۂ مبارکہ میں ﴿وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا﴾ کے الفاظ نے معین کر دیا ہے کہ یہاں ضمیرِ فاعلی میں ’’مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ‘‘ ہی مراد ہو سکتے ہیں‘ اللہ نہیں ہو سکتا‘ اس لیے کہ اللہ کو تو بطورِ گواہ لایا جا رہا ہے اور ظاہر ہے کہ گواہ اس فعل کا خود کرنے والا نہیں ہوتا‘ وہ کوئی نہ کوئی اُس کا غیر ہوگا۔﴿وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا﴾ کے دونوں مفہوم ممکن ہیں۔’’کافی ہے اللہ بطورِ گواہ‘‘ یا ’’کافی ہے اللہ بطورِ مددگار‘‘۔شہید کا لفظ قرآن مجید میں مددگار کے معنوں میں بھی آتا ہے۔سورۃ البقرۃ میں چیلنج کے انداز میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ ص وَادْعُوْا شُھَدَآءَ کُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾

’’اور اگر تم اس کتاب کے بارے میں شک میں مبتلا ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو اس کے مانند ایک سورت ہی بنا لاؤ‘ اور بلا لو اپنے مددگاروں کو اللہ کے سوا‘ اگر تم سچے ہو‘‘۔

بہرحال یہ معلوم ہو گیا کہ یہاں ’’لِیُظْھِرَہٗ‘‘ کا فاعل اللہ نہیں ہے بلکہ محمدؐ رسول اللہﷺ ہیں۔

یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اگرچہ اُمت کے نمائندہ کی حیثیت سے اور داعئ اوّل کی حیثیت سے محمدؐ رسول اللہﷺ کو نمایاں کیا گیا ہے‘ لیکن یہ کام تنہا ان کے کرنے کا نہیں ہے۔سورۃ الصّف میں اس بات کا اضافہ اس طور سے کیا گیا کہ اس آیت کے بعد اہل ایمان کو پکارا گیا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ؁ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ط ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

’’اے اہل ایمان! میں بتاؤں تمہیں وہ تجارت جو تمہیں عذابِ الیم سے بچا دے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر‘ اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے‘ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو‘‘۔

اس میں شک نہیں کہ دین کا غلبہ محمدؐ رسول اللہﷺ کا فرضِ منصبی ہے‘ لیکن اس کے لیے تن من دھن کھپانا اُن کی ذمہ داری ہے جو اللہ پر اور محمدﷺ پر ایمان کے مدعی ہیں۔لہٰذا یہ ایک اجتماعی جدوجہد ہو سکتی ہے‘ اس کے بغیر اس مقصد کا حصول ممکن نہیں ہے۔یہاں سورۃ الفتح میں اس کو واضح کر دیا یہ الفاظ لا کر: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ﴾ یعنی

یہ ایک اجتماعی جدوجہد ہوگی محمدٌ رسول اللہ ﷺ اور اُن کی جواُن کے ساتھ ہیں (رضی اللہ عنہم)۔ گویا اس جدوجہد کے لیے ایک مضبوط اور منظم جماعت ایک ناگزیر تقاضے اور شرطِ لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔

اقامتِ دین کی جدوجہد کے اَبعادِ ثلاثہ

اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والی اس جماعت کے رفقاء کے مطلوبہ اوصاف کے ضمن میں 3-dimensional space کا تصور ذہن میں رکھئے!

ہمارے بین الانسانی علائق میں جو خاندان کا ادارہ وجود میں آتا ہے اس میں بھی وہی 3-dimensional space کا تصور سامنے آتا ہے۔ اس کا آغاز دو افراد سے ہوتا ہے۔ جب اولاد ہو جاتی ہے تو بُعد ثانی (2nd dimension) کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب اولاد میں کثرت ہوتی ہے تو ان کے مابین رشتۂ اخوت قائم ہوتا ہے۔ یہ اس ادارے کا بُعد ثالث (3rd dimension) ہے۔ اسی طرح جو جماعت اقامت دین کی جدوجہد کے لیے کمر کسے اس کے مطلوبہ اوصاف کو بھی آپ اَبعادِ ثلاثہ (3-dimensions) کے حوالے سے سمجھ لیں۔ اس میں اوّلین dimension جہاد ہے' جو مال سے بھی ہوگا اور جان سے بھی۔ اسے آپ انفاقِ مال اور بذلِ نفس کہہ لیں یا جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کہہ لیں' کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ یہ وہ چیز ہے جو ہمارے منتخب نصاب میں بتمام وکمال وضاحت سے آ چکی ہے۔ سورۃ الصّف میں ﴿وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ط﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ سورۃ التوبہ میں ''اظهارُ دينِ الحق'' کی آیت مبارکہ سے کچھ ہی پہلے یہ آیت آئی ہے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴿۲۴﴾﴾

''(اے نبیؐ!) کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ' تمہارے بیٹے' تمہارے بھائی' تمہاری بیویاں' تمہارے عزیز و اقارب' تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں' تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے' اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں' تم کو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے۔ اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔''

پھر اس جہاد سے کنی کترانے پر جو سزا نفاق کی صورت میں ملتی ہے اس کا تذکرہ بھی منتخب نصاب میں سورۃ المنافقون اور سورۃ الحدید میں آ چکا ہے۔ اس جہاد کے لیے ابتدائی طریقۂ کار اور اساسی منہاج سورۃ الجمعہ میں بیان ہو گیا کہ ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ یعنی یہ سارے کا سارا کام قرآن حکیم ہی کے ذریعے ہوگا۔ پھر اس جہاد میں صبر و مصابرت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ہمارے منتخب نصاب کا حصّہ پنجم ان ہی مباحث پر مشتمل ہے۔ تو ایک dimension تو وہاں آ چکی۔

اب آیئے دوسری dimension کی طرف۔ ویسے تو عام اخلاقی اور معاشرتی وسماجی سطح پر اور دین کے اصل خلاصے اور لب لباب کی حیثیت سے وہ دو چیزیں بھی ہمارے منتخب نصاب میں آ چکی ہیں' یعنی اوّلاً مسلمانوں کا باہمی رشتۂ اخوت سورۃ الحجرات میں بیان ہو چکا ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ ''مؤمن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں''۔ اور ثانیاً اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک تعلق جو ایمان کا لازمی تقاضا ہے اور اس کے لیے خاص طور پر نماز کی اہمیت بھی قرآن حکیم کی روشنی میں بیان ہو چکی۔ سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج کی آیات میں نماز کو تعمیر سیرت کی اساسات میں سے اہم ترین اساس کی حیثیت سے بیان کیا گیا۔ سورۃ البقرۃ کے انیسویں رکوع میں الفاظ آ گئے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط﴾ (آیت ۱۵۳) ''اے اہل ایمان! صبر اور نماز کے ذریعے مدد حاصل کرو''۔ ان دونوں dimensions میں سے ایک کا تعلق اپنے ہم مقصد ساتھیوں سے اور ایک کا تعلق اللہ سے ہے جس کے لیے یہ کام کر رہے ہیں۔ ان کی ایک اضافی شان اس سطح پر آ کر نمایاں ہونی چاہیے۔ چنانچہ ان دو اضافی شانوں کے لیے یہ مقامات ہم نے اس منتخب نصاب (۲) میں شامل کیے ہیں۔ یہ دو dimensions سورۃ الفتح کی زیر مطالعہ آیت میں بڑی خوبصورتی سے آ گئیں: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾۔ اصل میں تو یہاں ''رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ'' ہی بیان کرنا مقصود ہے' لیکن تُعرفُ الاشياء باضدادها' کسی بھی شے کو اس کی ضد کے حوالے سے صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ عام اسلوب یہ ہے کہ نفی پہلے ہوتی ہے' اثبات بعد میں۔ لہٰذا فرمایا: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾۔ وقت کی کمی کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات یہاں بیان نہیں کیے جا سکتے' لیکن آپ ان واقعات کو ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن سے کہا تھا کہ غزوۂ بدر کے دوران اگر تم میری تلوار کی زد میں آ جاتے تو کبھی نہ چھوڑتا۔ غزوۂ بدر میں رشتۂ ایمانی کے مقابلے میں سب رشتے کٹ گئے تھے اور ماموں بھانجا' چچا بھتیجا' بھائی بھائی اور باپ بیٹا ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ اگر یہ نہ ہو تو اس جدوجہد میں اگلا قدم اٹھایا ہی نہیں جا سکتا۔ حدیث نبویؐ ہے کہ مؤمن کامل صرف وہی ہے جس کی محبت اور نفرت کا معیارِ واحد صرف اللہ رہ جائے۔ فرمایا:

((مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ))[1]

''جس نے محبت کی تو صرف اللہ کے لیے' کسی سے بغض وعداوت رکھی تو صرف اللہ کے لیے' کسی کو کچھ دیا تو صرف اللہ کے لیے اور کسی سے کچھ روکا تو صرف اللہ کے لیے'اس نے اپنے ایمان کی تکمیل کر لی''۔

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب السنۃ' باب الدلیل علی زیادۃ الایمان ونقصانہ۔

اب یہ تمام چیزیں ہمارے دروس وخطابات میں تفصیلاً آتی رہی ہیں۔ میں صرف حوالہ دے رہا ہوں۔ اس کو اب 2nd dimension سمجھیں کہ اس اجتماعی جدوجہد میں آ کر یہ رشتہ صرف اخوت ہی نہیں بلکہ رفاقت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ رفیق کے لفظ کی اصل حقیقت کیا ہے۔ ''رِفق'' نرمی کو کہا جاتا ہے' اور اس کے لیے اقبال نے کہا ہے ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

لہٰذا اس سطح پر جو کیفیت مطلوب ہے اس کو ظاہر کرنے کے لیے یہ لفظ (رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ) اخوت کے لفظ سے بھی زیادہ مناسب ہے۔

اب تیسری dimension ملاحظہ کریں:

﴿تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ز﴾

''تم دیکھو گے انہیں تو رکوع وسجود' اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔''

''تَرٰى'' فعل مضارع ہے' اس میں حال اور مستقبل دونوں cover ہو جاتے ہیں (تم دیکھتے ہو یا تم دیکھو گے)۔ صحابہ کرام ؓ کا یہ نقشہ بالفعل تھا جسے ہر دیکھنے والا چشمِ سر دیکھ رہا تھا' اور آئندہ بھی کبھی یہ جدوجہد کامیاب نہیں ہوگی جب تک کہ اس کا ایک عکس اُن لوگوں کے اندر موجود نہ ہو جو اِس کام کا بیڑا اٹھائیں اور اس کا داعیہ لے کر اٹھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر کام کا ایک محرک ہوتا ہے۔ اس جدوجہد کا محرکِ واحد اگر اللہ کی رضا نہیں ہے تو اب اس میں ملاوٹ ہوگئی۔ اس کو ہم ایک اعتبار سے شرک سے بھی تعبیر کریں گے اس لیے کہ خلوص واخلاص توحید کا لازمی تقاضا ہے' جبکہ ریا اور سُمعہ شرک ہے۔ یہ شرکِ خفی ہے' لیکن شرک تو بہرحال ہے۔ حدیث نبویؐ ہے:

((مَنْ صَلّٰى يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ صَامَ يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ))[1]

''جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اس نے شرک کیا' جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ کیا اس نے شرک کیا۔''

(۱) مسند احمد۔

اور یہ حدیث بھی ہمارے دروس میں بارہا بیان ہو چکی ہے کہ قیامت کے روز ایک ایسے شخص کو محاسبہ کے لیے پیش کیا جائے گا جو جہاد فی سبیل اللہ کے دوران مقتول ہوا تھا اور دنیا میں شہید سمجھا جاتا تھا۔ اس سے جب اس کے اعمال کے بارے میں دریافت کیا جائے گا تو وہ کہے گا: اے اللہ! میں نے تیرے راستے میں جنگ کی تاکہ تو راضی ہو جائے اور میں نے اپنی جان دے دی۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس کی یہ بات اس کے مُنہ پر دے ماریں گے اور فرمائیں گے: ((لٰكِنَّكَ قَدْ قَاتَلْتَ لِاَنْ يُّقَالَ جَرِیْءٌ))[1] ''تو نے تو جنگ اس لیے کی تھی کہ کہا جائے کہ تو بہت جری ہے''۔ کہا جائے کہ بڑا جی دار آدمی ہے' دیکھو کیسے لڑ رہا ہے۔ ((فَقَدْ قِيْلَ)) ''پس وہ کہا جا چکا۔'' تمہاری مراد مل چکی' اب یہاں تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور فرشتوں کو حکم ہوگا اور وہ اسے مُنہ کے بل گھسیٹتے ہوئے جہنم میں جھونک دیں گے۔ تو اب یہ جو خلوص واخلاص ہے کہ یہ کام صرف اللہ کے لیے ہوگا' اس کے لیے ضروری ہے کہ بندے کا تعلق مع اللہ مضبوط ہو' اور اس کا سب سے بڑا ذریعہ نماز ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا﴾ ''تم ان کو دیکھتے ہو رکوع کرتے ہوئے' سجدہ کرتے ہوئے''۔ یہ ان کی شخصیت' سیرت اور ان کے کردار کا ایک ایسا جزوِ لاینفک بن جاتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی نماز کے کھونٹے سے بندھی ہوئی ہے' وہ ان کی شخصیت کا ایک نمایاں وصف ہے۔

(۱) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق النار۔

فضل خداوندی کا جامع مفہوم

﴿یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا﴾ ''اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مشغول ہیں''۔ اب یہاں دو الفاظ آئے ہیں: اللہ کے فضل کی تلاش اور اللہ کی رضا کی تلاش۔ پہلے تو فضل کو سمجھئے۔ قرآن حکیم کے جو مقامات خود آپ کو مستحضر ہیں ان میں ذرا نوٹ کیجیے کہ فضل کس کس معنیٰ میں آیا ہے۔

سورۃ الجمعۃ میں اس دنیا کے مادی رزق کے لیے بھی فضل کا لفظ آیا ہے۔ ﴿فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ......﴾ (آیت ۱۰) ''پھر جب نماز ادا ہو جائے تو (اب تمہیں اجازت ہے کہ) زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو''، یعنی معاشی جدوجہد میں اب کوئی شے آڑے نہیں ہے، تمہیں کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ تو اس دنیا میں انسان کو جو مادی رزق حاصل ہوتا ہے، یعنی خوراک اور زندگی کے وسائل وضروریات، یہ بھی فضل ہے۔

سورۃ الجمعۃ ہی میں حضور ﷺ کی بعثت کو اہل ایمان کے لیے اللہ کا فضل قرار دیا گیا۔ اُمیین پر یہ فضل کہ نبی ﷺ اُن میں مبعوث ہوئے ہیں اور آخرین پر یہ فضل کہ وہ بھی اس اُمت میں شامل ہو جائیں گے۔ یہ سب کیا ہے؟ ﴿ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۴﴾﴾ ''یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے، اور اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے''۔ یہ فضل حضور ﷺ پر ہوا تو سب سے بڑا فضل ہوا: ﴿اِنَّ فَضْلَہٗ کَانَ عَلَیْکَ کَبِیْرًا ﴿۸۷﴾﴾ (بنی اسرائیل) ''(اے محمدؐ!) آپ پر تو جو اللہ کا فضل ہوا ہے وہ یقیناً بہت بڑا ہے''۔ جو مقام ومرتبہ اللہ نے اپنے نبیؐ کو عطا فرمایا وہ یقیناً بہت اعلیٰ وارفع ہے ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر! تو یہ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔

تیسرا فضل سورۃ الحدید میں بیان ہوا جہاں جنت کو اللہ کا فضل کہا گیا:

﴿سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ ط ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۲۱﴾﴾

''دوڑو اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے ربّ کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان وزمین جیسی ہے، جو مہیا کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہوں۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے''۔

اب ظاہر ہے کہ ﴿یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا﴾ میں فضل کا پہلا مفہوم تو مراد نہیں ہو سکتا۔ معاشی جدوجہد اپنی جگہ ایک جائز جدوجہد ہے، لیکن اس مقام پر یہ مفہوم سیاق وسباق کے اعتبار سے درست نہیں ہوگا۔ بقیہ دونوں مفہوم موجود ہیں۔ ان میں سے بھی زیادہ معین طور پر سورۃ الحدید کے حوالے سے جب آپ اس کو سمجھیں گے تو وہ جنت کا حصول ہے۔ یوں سمجھئے کہ یہ ادنیٰ نصب العین ہے۔ یہاں اب ادنیٰ سے اعلیٰ کی جانب ''صعود'' ہوگا۔ یہ صعودی ترتیب ہے۔ کہیں ترتیب نزولی ہوتی ہے کہ پہلے اعلیٰ کا ذکر ہوتا ہے اور پھر ادنیٰ کا۔ لیکن یہاں صعودی ترتیب ہے کہ پہلا مقصود جنت ہے، لیکن بلند تر مقصد اللہ کی رضا ہے، جو ایک بندۂ مؤمن کے لیے بلند ترین مقام ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر صحابہ کرام ؓ کے لیے خاص طور پر یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ﴾ ''اللہ اُن سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے''۔

یہاں یہ بات نوٹ کر لیں کہ ہم پر یہ اللہ کا فضل ہوا ہے کہ ابتدا ہی سے ہم پر یہ بات واضح تھی کہ نصب العین کے درجے میں ہمارے سامنے دنیا کی کوئی شے نہیں ہوگی۔ چنانچہ دین کا غلبہ بھی ہمارا نصب العین نہیں ہے۔ اس کے لیے جدوجہد ایک فرض ہے، نصب العین نہیں ہے۔ ہمارا نصب العین صرف آخرت کی فوز وفلاح، نجات، کامیابی اور اللہ کی رضا ہے۔ نصب العین کے مقام پر اس کے ساتھ کسی اور چیز کو شامل کرنا اپنے فکر کے اندر کجی پیدا کرنا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ نماز اور روزہ دونوں فرض ہیں۔ اب ان میں سے ایک کو مقصود سمجھ لینا اور دوسرے کو اس کا ذریعہ قرار دے دینا یہ ترجیح بلا مرجح ہو جائے گا۔ یہ تمام فرائض ہیں، نماز اپنی جگہ فرض ہے، زکوٰۃ اپنی جگہ فرض ہے، اقامتِ دین کی جدوجہد اپنی جگہ فرض ہے، دعوتِ دین میں اپنی صلاحیتیں لگانا اپنی جگہ فرض ہے، لیکن ان میں سے کسی ایک فرض کو اٹھا کر نصب العین بنا دینا اور دوسرے کو اس کا ذریعہ بنا کر ایک ثانوی حیثیت تفویض کر دینا یہ بھی ترجیح بلا مرجح ہے۔ نصب العین صرف ایک ہے اور وہ ہے اُخروی نجات، جنت کا حصول اور اللہ کی رضا۔ اور ان میں بھی بلند ترین شے اللہ کی رضا ہے۔

چہروں پر نورِ بندگی کا ظہور

آگے فرمایا: ﴿سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ط﴾ ''علامت ہے اُن کی اُن کے چہروں پر سجدوں کے آثار سے''۔ اس علامت سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ خدا ترسی کا نور اُن کے چہروں پر نمایاں ہوتا ہے۔ اب اس ضمن میں خواہ مخواہ کی بحثیں چھڑ جاتی ہیں کہ آیا کثرتِ سجود سے پیشانی پر جو نشان پڑ جاتا ہے آیا یہ بھی اس میں شامل ہے یا نہیں! اِس دَور کی تفاسیر میں اس موضوع پر آپس میں کچھ نوک جھونک بھی ہوئی ہے، حالانکہ میرے نزدیک وہ بے محل ہے، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بھی یقیناً آثار میں سے ہے، اس کی نفی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی تکلفاً اپنی پیشانی کو خوب رگڑ رہا ہے کہ ذرا نشان اور ابھر آئے پھر تو یہ ریاکاری ہے۔ مزید یہ کہ سجدوں

کا صرف وہی ایک اثر چہرے پر نہیں ہوتا۔ درحقیقت یہ تو چہرے کی ایک خاص کیفیت ہوتی ہے کہ مقامِ بندگی کا اس سے ظہور ہو رہا ہوتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ یہ اللہ کے بندے کا چہرہ ہے۔ سجدوں کے آثار کسی معین نشان تک محدود نہیں ہیں' لیکن اس معین نشان کو اس سے زبردستی خارج کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سجدوں کے اثرات بہت وسیع مفہوم کے حامل ہیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ ان کے چہرے ان کی باطنی کیفیات کی غمازی کر رہے ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم ''شکوہ'' میں کیا خوب کہا ہے ؎

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہے غمازِ چمن!

تو یہ چہرہ جو ہے یہ انسان کی باطنی شخصیت کا ایک عکس لیے ہوئے ہوتا ہے۔ ﴿سِیۡمَاهُمۡ فِیۡ وُجُوۡهِهِمۡ مِّنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ ؕ﴾ ان کی شناخت یہ ہے کہ ان کے چہروں میں سجدوں کے آثار ہویدا ہوں گے' نمایاں ہوں گے۔

تورات وانجیل میں صحابہ کرامؓ کی مثال

آگے ارشاد ہوا: ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ ۚۛ وَمَثَلُهُمۡ فِی الۡاِنۡجِیۡلِ ۚۛ﴾ ''یہ ہے ان کی مثال تورات میں' اور ان کی مثال انجیل میں''۔ یہاں پھر ترکیب کا معاملہ ہے۔ جیسے میں نے عرض کیا تھا کہ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗۤ﴾ کے الفاظ میں ترکیبِ نحوی کا فرق پڑتا ہے کہ آیا ''مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ'' کو مرکب توصیفی مان کر وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗ کا معطوف علیہ قرار دیا جائے اور دونوں کو جمع کر کے مبتدا مانا جائے' یا یہ کہ ''مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ'' مبتدا اور خبر سمیت پورا جملہ اسمیہ ہوا اور آگے استیناف مانا جائے کہ ''وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗ'' سے نیا جملہ شروع ہو رہا ہے۔ زیرِ نظر الفاظ ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ ۚۛ وَمَثَلُهُمۡ فِی الۡاِنۡجِیۡلِ ۚۛ﴾ کے معاملے میں تلاوت میں ہی ایک فرق واقع ہو جاتا ہے۔ مصحف میں ''التورٰىة'' کے بعد بھی تین نقطے لگے ہوئے ہیں اور ''الانجیل'' کے بعد بھی۔ اسے قرآن مجید کی اصطلاح میں ''معانقہ'' کہتے ہیں اور قرآن مجید میں غالباً ایسے چودہ مقامات ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ قاری چاہے پہلے تین نقطوں پر رک جائے چاہے دوسرے تین نقطوں پر۔ چنانچہ یہاں ایسے بھی پڑھا جا سکتا ہے: ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ﴾ ''یہ ہے ان کی صفت تورات میں''۔ ﴿وَمَثَلُهُمۡ فِی الۡاِنۡجِیۡلِ ۚ كَزَرۡعٍ اَخۡرَجَ شَطۡـَٔهٗ......الآیۃ﴾ ''اور انجیل میں ان کی مثال یوں بیان کی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے اپنی کونپل نکالی......'' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ وَمَثَلُهُمۡ فِی الۡاِنۡجِیۡلِ﴾ اس کو اکٹھا پڑھا جائے اور ﴿كَزَرۡعٍ اَخۡرَجَ شَطۡـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ﴾ کو استیناف مان کر نیا جملہ شروع کیا جائے۔ یعنی یہ دو جگہ جو تین تین نقطے ہوتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے مابین جو عبارت ہے وہ عبارت ماسبق سے بھی جڑ سکتی ہے اور اس کے بعد سے نیا جملہ شروع ہو جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ عبارت مابعد سے جڑے اور اس سے پہلے سابق جملہ ختم ہو جائے۔

قرآن حکیم میں سب سے پہلا معانقہ سورۃ البقرۃ کے بالکل شروع میں ہے۔ وہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۚۛ فِیۡهِ ۚۛ هُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ﴿۲﴾﴾ اب ''فِیۡهِ'' کو ماسبق سے جوڑیں گے تو اس طرح پڑھا جائے گا ﴿ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡهِ﴾ ''یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں''۔ ﴿هُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۲﴾﴾ ''ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لیے''۔ اور اگر ''فِیۡهِ'' کو مابعد سے جوڑا جائے تو یوں پڑھا جا سکتا ہے: ﴿ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ لَا رَیۡبَ﴾ ''یہ بلاشبہ (اللہ کی) کتاب ہے۔'' ﴿فِیۡهِ هُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۲﴾﴾ ''اس میں ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لیے''۔ اسی طرح زیرِ نظر آیت میں اگر ''التَّوۡرٰىةِ'' پر وقف کرتے ہوئے یوں پڑھا جائے: ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ﴾ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ جو مثال یہاں بیان ہوئی ہے کہ نورِ بندگی سے اُن کے چہرے دمکتے ہوئے ہوں گے اور سجدوں کے آثار اُن کے چہروں میں نمایاں ہوں گے' یہ بات صحابہ کرام ﷺ کی علامات میں سے تورات میں آئی ہوگی۔ اور اگلا جملہ اس طرح ہوگا: ﴿وَمَثَلُهُمۡ فِی الۡاِنۡجِیۡلِ ۚ كَزَرۡعٍ اَخۡرَجَ شَطۡـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسۡتَغۡلَظَ فَاسۡتَوٰی عَلٰی سُوۡقِهٖ﴾ ''اور ان کی مثال انجیل میں یہ بیان کی گئی تھی گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے اپنی کونپل نکالی' پھر اُس کو تقویت دی' پھر وہ گدرائی' پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی''۔ اور اگر یوں پڑھا جائے: ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ وَمَثَلُهُمۡ فِی الۡاِنۡجِیۡلِ﴾ تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان کی یہ علامت کہ ان کے چہروں میں سجدوں کے آثار ہویدا ہوں گے' تورات میں بھی مذکور ہے اور انجیل میں بھی مذکور ہے۔ اور آگے جو بات شروع ہو رہی ہے وہ مستقبل کی ایک پیشین گوئی ہے کہ اب یہ کھیتی کیسے پروان چڑھے گی اور اس میں کیسے ترقی ہو گی۔ بہرحال یہ دونوں امکانات بالکل مساوی ہیں اور اس میں نتیجے کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ مجھے زیادہ انشراحِ صدر اسی دوسرے امکان پر ہے کہ ''الانجیل'' پر آ کر رکا جائے ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ وَمَثَلُهُمۡ فِی الۡاِنۡجِیۡلِ﴾ اس لیے کہ ''اَلۡقُرۡاٰنُ یُفَسِّرُ بَعۡضُهٗ بَعۡضًا'' کے مصداق آگے آنے والی پیشین گوئی کا ایک معنوی تعلق سورۃ النور میں بیان کردہ وعدۂ استخلاف سے جڑتا ہے: ﴿لَیَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ كَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ۪﴾ (النور: ۵۵) ''وہ لازماً اُن کو اس طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے''۔ ہمارے اس منتخب نصاب (۲) میں یہ مقام بھی آئے گا۔

یہ حقیقت ہے کہ صحابہ کرام ؓ کی یہ علامات تورات اور انجیل میں موجود تھیں۔ مستند تاریخی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف بحیثیت مجموعی اس جماعت کی علامات مذکور تھیں بلکہ بعض اہم افراد کے حلیے تک بھی اہل کتاب کے ہاں موجود تھے۔ چنانچہ بیت المقدس کی فتح کے موقع پر حضرت عمر فاروق ؓ کے ساتھ جو معاملہ ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عیسائیوں کے مذہبی راہنماؤں نے اپنی کتابیں ہاتھوں میں لی ہوئی تھیں اور وہ ان میں مذکور حضرت عمر ؓ کی شخصیت کے آثار کو دیکھ رہے تھے۔ اور اسی بنیاد پر انہوں نے بیت المقدس کے دروازے کھول دیے۔ بہر حال حضور ﷺ اور ان کے صحابہ کا ذکر سابقہ کتابوں میں موجود تھا اور اُن کے آثار و علامات پیشگی طور پر وہاں مندرج تھے۔

کاشتکار کا دل لبھانے والی خوش منظر کھیتی

اب اُس وقت جو کھیتی بالفعل اُگ رہی تھی اس کا کیا خوب نقشہ کھینچا گیا ہے: ﴿كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ﴾ ''(اس جماعت کی مثال) ایک کھیتی کی مانند ہے جس نے پہلے اپنی سوئی (کونپل) نکالی' پھر اُس کو تقویت دی' پھر وہ گدرائی (موٹی ہوگئی)' پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی۔'' سب سے پہلے کھیتی کی بڑی نرم و نازک کونپلیں اور پتیاں نکلتی ہیں' پھر وہ ذرا اوپر کو آتی ہیں تو ان میں کچھ قوت پیدا ہوتی ہے' پھر یہ ذرا گدراتی ہیں' موٹی ہوتی ہیں' اس کے بعد اپنی نال پر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ تو جس طرح کہ ایک کھیتی کا تدریجی منظر نگاہوں کے سامنے آتا ہے اسی طرح یہ صحابہ کرام ؓ کی کھیتی ہے جن میں سے ایک ایک پودے پر محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے جو محنت کی ہے اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ حضور ﷺ کا مقام و مرتبہ' آپؐ کی شخصیت' آپؐ کی صلاحیتیں' آپؐ کی استعدادِ کار اور آپؐ کی محنت و مشقت ان سب کو ذرا ذہن میں رکھئے' جس کے لیے امتناعِ نظیر کی بحث ہے کہ آپؐ کی کوئی مثال ممکن ہی نہیں' اور دوسری طرف اِس امرِ واقعہ کو سامنے رکھئے کہ آپؐ کی مکی زندگی کی دس برس کی محنت کا حاصل ایک سو افراد سے زیادہ نہیں تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کھیتی پر آپؐ کی کتنی محنت ہوئی ہوگی اور اس کا ایک ایک پودا حضور ﷺ کو کتنا عزیز' کتنا پیارا اور کتنا محبوب ہوگا اور حضور ﷺ کی نگاہ میں اس کی کتنی قدر و منزلت ہوگی۔ اس کے بعد جب یہ کھیتی اچھی ہے تو کس کا دل باغ باغ ہوا ہوگا؟ کس کو اپنی نگاہوں کے سامنے اپنی محنت کے ثمرات دیکھ کر خوشی حاصل ہوئی ہوگی؟ ظاہر ہے اُسی کو جس کے خون پسینے سے یہ کھیتی سیراب ہوئی اور سینچی گئی ہے۔ فیضؔ نے کہا تھا ؎

دھرتی کے کونے کھدروں میں پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو
پھر مٹی سینچو اشکوں سے' پھر اگلی رُت کی فکر کرو!

تو جس نے اس کھیتی کو اپنے خون پسینے سے سیراب کیا ہے اس کھیتی کو دیکھ کر اس کا دل باغ باغ کیوں نہ ہوا ہوگا! اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا: ﴿يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۭ﴾ ''کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ ان کے ذریعے سے کافروں کا دل جلائے''۔ ظاہر ہے کہ وہ کاشت کار جس نے محنتیں کی تھیں' ہل چلایا تھا' جس نے راتوں کو جاگ کر کھیتی کو پانی دیا تھا' اب کھیتی اچھی ہے' بہار پر آئے گی تو اس کا دل تو باغ باغ ہوگا۔ میں نے کئی دفعہ عرض کیا ہے کہ عربی میں عجیب کے معنی وہ نہیں جو ہم اردو میں استعمال کرتے ہیں' یعنی کوئی غیر معمولی (unusual) اور abnormal شے' بلکہ عربی میں عجیب شے وہ ہے جو دل آویز ہو' جو دل کو لبھائے' جس کو دیکھ کر انسان خوش ہو جائے۔

اب یہاں ﴿يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ﴾ کے الفاظ کے ساتھ ہی اس کا عکس بھی بیان فرما دیا: ﴿لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ ''تاکہ ان کے ذریعے سے کافروں کا دل جلائے''۔ اس لہلہاتی ہوئی کھیتی کے ذریعے سے کفار کے دل جلیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ جو رکاوٹیں ڈالتے رہے' ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے کہ یہ کھیتی نہ اُگے' جنہوں نے قدم قدم پر مخالفتیں کیں' جنہوں نے ان کا راستہ روکنے کی ہر تدبیر اختیار کر لی' اس کھیتی کو ہری بھری دیکھ کر اُن کا دل تو جلے گا۔ یہ بہت اہم نکتہ ہے اور ہمارے لیے اپنے دلوں کو جانچنے کے لیے ایک معیار ہے کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی کھیتی پر جس کا دل جلتا ہو وہ حقیقت ایمان سے بالکل بے بہرہ ہے۔ اگر محمد ﷺ سے تعلق ہے تو اس کھیتی پر جیسے ان کا دل باغ باغ ہوا ویسے ہی ہر اُس شخص کا دل باغ باغ ہونا چاہیے جسے کوئی تعلق خاطر محمدٌ رسول اللہ ﷺ سے ہے۔ صحابہ ؓ سے بغض ہو اور دعویٰ محمد ﷺ سے پیار کا ہو تو یہ جھوٹ ہے' اس دعویٰ میں کوئی صداقت نہیں۔ یقیناً یہ چیز ایک لٹمس پیپر ہے جو بتا دیتا ہے کہ یہ محلول acidic ہے یا alkaline ہے۔ حضور ﷺ کا وہ خطبہ دراصل اسی معیار کی وضاحت ہے:

((اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِيْ اَصْحَابِيْ' اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِيْ اَصْحَابِيْ' لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا بَعْدِيْ' فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّيْ اَحَبَّهُمْ' وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِيْ اَبْغَضَهُمْ)) [1]

''میرے صحابہؓ کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو' میرے صحابہؓ کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو! میرے بعد کہیں ان کو ہدفِ ملامت نہ بنا دینا (اور اُن کو کہیں اپنی تنقیدوں کا نشانہ نہ بنانا)۔ آگاہ ہو جاؤ' جو بھی اُن سے محبت کرے گا وہ درحقیقت میری محبت کے عکس کے طور پر اُن سے محبت کرے گا اور جو اُن سے بغض رکھے گا تو وہ مجھ سے بغض کی وجہ سے ایسا کرے گا''۔

(۱) سنن الترمذی' کتاب المناقب عن رسول اللہ ﷺ' باب فیمن سبّ اصحاب النبیؐ۔

یعنی جس کو مجھ سے محبت ہوگی اس کو میرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے محبت ہوگی اور جس کو مجھ سے بغض ہے درحقیقت وہی ہے جو اُن سے بغض رکھتا ہے۔ ایسے بدبخت کے دل میں دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض ہے لیکن وہ مصلحت کی بنا پر اس کا اظہار نہیں کرتا اور اپنا غصہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر نکالتا ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے' معمولی بات نہیں' اس کو اس آیت کے حوالے سے اچھی طرح ذہن نشین کرلیں اور دل میں بٹھالیں اور اپنے دلوں کو ٹٹولتے رہیں۔

یہ ضرور ہے کہ ہم صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو معصوم نہیں سمجھتے۔ معصومیت خاصۂ نبوت ہے' لہٰذا آپ ان کے کسی فعل سے اختلاف کریں تو اس میں کوئی حرج نہیں' لیکن یہ بات کہ دل میں ان کی محبت نہ رہے' ان کی عظمت اور قدر کا احساس نہ رہے' یہ درحقیقت ایمان سے محرومی کی علامت ہے۔ ان دونوں چیزوں میں فرق ہے۔ اگر ان کو معصوم سمجھیں گے تو اصل میں ختم نبوت کی مہر کو توڑیں گے۔ چنانچہ ابوبکرؓ معصوم ہیں نہ عمرؓ معصوم ہیں' تا بہ دیگراں چہ رسد! حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خود کہا تھا کہ اگر میں سیدھا چلوں تو تم پر میری اطاعت فرض ہے اور اگر کہیں میں ٹیڑھا ہونے لگوں تو تم پر لازم ہے کہ مجھے سیدھا کرو! بس یہیں پر فرق واضح ہوگیا۔ ظاہر بات ہے کہ محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ نہیں تھی کہ لوگ انہیں سیدھا کریں۔ وہاں معاملہ یک طرفہ تھا' وہ لوگوں کو سیدھا کرنے آئے تھے' لیکن معصومیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوئی' اب وہ شان کسی کی نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین تک کا معاملہ یہی ہے کہ اگر وہ دوسروں کو سیدھا کرسکتے ہیں تو کسی وقت ضرورت پیش آسکتی ہے کہ لوگ انہیں سیدھا کریں۔ اس اعتبار سے اگر اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھیں گے تو گمراہی ہو جائے گی۔ ع گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی! لیکن ان کی محبت' عظمت' تعظیم اور قدر و منزلت نگاہوں میں ہونا عین لازمۂ ایمان ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت واجرِ عظیم کا وعدہ

آیت کے آخری حصے میں فرمایا: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٢٩﴾﴾ ''اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے' اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے''۔ اسی طرح کا ایک وعدہ' جیسا کہ میں نے عرض کیا' سورۃ النور میں اس سے زیادہ گاڑھی شکل میں آیا ہے: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص﴾ (آیت ۵۵) ''اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ لازماً ان کو زمین میں اسی طرح خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے''۔

یہاں (سورۃ الفتح میں) اس دنیاوی وعدہ کا ذکر نہیں ہو رہا' بلکہ یہاں اُخروی وعدے کا ذکر ہو رہا ہے جو اصل نصب العین ہے۔ اصل بنیاد یہ ہے کہ دنیا میں صحابہؓ کے ساتھ جو وعدہ تھا وہ قطعی تھا اور وہ پورا ہوا' لیکن دنیا میں کسی اور جماعت کے ساتھ یہ وعدہ حتمی اور یقینی نہیں ہے کہ لازماً غالب کر دیے جائیں گے۔ یہ اللہ کے علم میں ہے کہ کب کسی کام کے لیے کوئی وقت معین ہے اور اس کے لیے کب اس کی حکمتِ بالغہ کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس میں تفویض الامر الی اللہ کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ اور جب نصب العین درست ہو جائے گا تو آپ سے آپ اس میں غلطی کا احتمال ختم ہو جائے گا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ یہ بحث سورۃ الصّف میں بھی آئی ہے۔ وہاں فرمایا: ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ط نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ط﴾ ''اور ایک دوسری چیز جو تمہیں محبوب ہے (وہ بھی تمہیں ملے گی۔ یعنی) اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح''۔ اس کو دیکھئے کیسے لطیف انداز میں فرمایا: ''تُحِبُّوْنَهَا'' کہ جو تمہیں پسند ہے' جو تم چاہتے ہو۔ یہ تمہاری ایک فطری خواہش ہے۔ ہر انسان کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ جو محنت میں کر رہا ہوں اس کا نتیجہ میں اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھوں۔ اس درجے میں تمہارے ساتھ یہ وعدہ بھی ہے' لیکن یہ کوئی ضروری شے نہیں ہے۔ تم سے تو یہ مطلوب ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ لگا دو' اور جھونک دو اور اس طرح اپنے خلوص و اخلاص کا ثبوت فراہم کردو۔ تم ثابت کردو کہ تن من دھن اللہ سے زیادہ عزیز نہیں تھے۔

سورۃ التوبۃ کی آیت ۲۴ ذہنوں میں تازہ کیجیے جہاں ایک میزان قائم کر دی گئی ہے کہ اگر مال و دولتِ دنیا اور رشتہ و پیوند تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو پھر اللہ کا فیصلہ ظاہر ہونے کا انتظار کرو۔ تمہیں یہ ثبوت فراہم کرنا ہوگا کہ مؤخر الذکر تین محبتوں کا پلڑا مقدم الذکر آٹھ محبتوں کے پلڑے سے بھاری ہے۔ اس کا ثبوت فراہم کرنا تمہاری کامیابی کے لیے شرطِ لازم ہے۔ تم نے یہ ثبوت فراہم کر دیا تو تم کامیاب ٹھہرے۔ لیکن دین کو بالفعل غالب کر دینا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ کتنے انبیاء آئے' انہوں نے اپنا یہ ثبوت دیا اور سرخرو ہو گئے۔ دین غالب ہو یا نہ ہو' اس کی اُن سے باز پُرس نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت میں کس خوش قسمت کے لیے یہ سہرا رکھا ہوا ہے جس کے سر اُسے باندھنا ہے' یہ اس کا اپنا انتخاب ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ط﴾ (الحج: ۷۵) ''اللہ چن لیتا ہے ملائکہ میں سے بھی پیغام رساں اور انسانوں میں سے بھی''۔ ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ط﴾ (الانعام: ۱۲۴) ''اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا کام کس سے لے اور کس طرح لے''۔ کس کا کیا مقام ظاہر کرنا ہے یہ اس کا فیصلہ ہے۔ تم نے اگر اس کی راہ میں اپنا تن من دھن لگا دیا تو تم سرخرو ہو گئے۔ تمہارا مطلوب و مقصود اور نصب العین آخرت کی فوز و فلاح اور اللہ کی رضا کے علاوہ کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ لہٰذا اس آیت میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ دوسری بات (یعنی تمکن فی الارض) کا ذکر نہیں کیا گیا۔ البتہ یہ کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ہو کر رہنا تھا' سو ہوا۔ پھر اس کے ساتھ خلافت راشدہ کا تتمہ آنا تھا وہ آیا۔ اب غور کیجیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ثقیفہ بنی ساعدہ میں انصار پورے دعوے اور

دلائل کے ساتھ ڈٹے ہوئے تھے کہ خلافت ہمارا حق ہے' ہماری مدد سے یہ صورت پیدا ہوئی' ورنہ مہاجرین بے چارے تو بے یار و مددگار اپنے گھر بار چھوڑ نے پر مجبور ہو گئے تھے۔ دلیل بڑی قوی تھی۔ آپ سوچئے کہ یہ معاملات کتنے حساس اور کس قدر جذباتی ہوتے ہیں' لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ ایک حدیث نبویؐ سنا رہے ہیں کہ: ((اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ))[1] اور بات ختم ہو گئی۔

(۱) مسند احمد

اس ضمن میں یقیناً مشیتِ خداوندی کو دخل ہے۔ دین کا بالفعل غلبہ اگر ہو گا تو اللہ کے کرنے سے ہو گا۔ سورۃ الانفال میں ارشاد ہوا: ﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ص﴾ (آیت ۱۷) کہ اے مسلمانو! یہ جو میدانِ بدر میں تم نے ستر سردارانِ قریش مار لیے تو یہ نہ سمجھنا کہ انہیں تم نے اپنے زورِ بازو سے کھیت کر لیا' بلکہ ان کو تو اللہ نے قتل کیا۔ فاعلِ حقیقی اور مؤثرِ حقیقی اللہ کے سوا کوئی اور ہے ہی نہیں۔ انسان کاسبِ اعمال تو ہے' خالقِ اعمال نہیں ہے' خالقِ اعمال اللہ کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ تو ان دونوں چیزوں کو بیک وقت ذہن میں رکھئے۔ اللہ جب چاہے گا اس کے دین کا غلبہ ہو جائے گا۔ اگر یہ بات ذہن میں نہ ہو تو انسان عجلت پسندی کا شکار ہو جاتا ہے' پھر by hook or by crook کا معاملہ ہوتا ہے کہ اگر سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلتا ہو تو انگلیاں ٹیڑھی کر کے نکالو' جو راستہ ہم نے پہلے طے کیا تھا اس راستے پر چلتے ہوئے کام نہیں ہو رہا تو کوئی راہِ یسیر (short cut) تلاش کرو' کہیں سے کوئی چھلانگ لگاؤ۔ درحقیقت یہ تمام چیزیں منطقی طور پر نصب العین کے غلط تعین کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ بات چھوٹی ہوتی ہے' لیکن اس کے نتائج بہت دور تک جا کر نکلتے ہیں۔

آیت کے آخری ٹکڑے میں جو لفظ "مِنْهُمْ" آیا ہے اس کے بارے میں بھی ایک دقیق بحث ہے کہ یہ "مِنْ بیانیہ" ہے یا "مِنْ تبعیضیہ"! صحابہ کرامؓ سے بغض رکھنے والے لوگ اسے "مِن" تبعیضیہ قرار دے کر اس سے دلیل پکڑ لیتے ہیں۔ قرآن مجید کے بارے میں ایک بنیادی بات جان لیجیے کہ اس کا ایک بڑا "وصف لا ینفک" یہ ہے کہ اس میں اہل زیغ کے لیے بھی پوری غذا موجود ہے۔ جو کوئی کجی کا طالب ہے اس کے لیے بھی اللہ نے اس میں مواد رکھا ہوا ہے اور جو ہدایت کا طالب ہے اس کے لیے بھی اس میں وافر مواد موجود ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ "اللہ گمراہ کرتا ہے اسی قرآن کے ذریعے سے بہتوں کو اور ہدایت دیتا ہے اسی قرآن کے ذریعے سے بہتوں کو"۔ چنانچہ قرآن مجید میں ایسے مقامات موجود ہیں جنہیں اہل تشیع نے غلط معنی پہنائے ہیں۔ اسی طرح کا ایک مقام یہ ہے۔ اہل تشیع اسے "مِن" تبعیضیہ قرار دیتے ہیں اور اس سے یہ مفہوم اخذ کرتے ہیں کہ یہ وعدہ تمام صحابہ سے نہیں تھا' بلکہ بعض صحابہ سے تھا۔ حالانکہ یہ "مِن" بیانیہ ہے جو کسی کے وصف کو ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے' یعنی یہ لوگ جن میں ایمان اور عمل صالح کا وصف ہے ان سے یہ وعدہ کیا جا رہا ہے۔ یہاں "مِن" صرف اخبار کے لیے ہے کہ ان کے بارے میں خبر دی جا رہی ہے' ان کے وصف کا بیان ہو رہا ہے۔ اوّل تو اسے مِن تبعیضیہ قرار دینا ہی ترجیح بلا مرجح ہے۔ ان کے پاس اس کی کیا دلیل ہے؟ اور اگر بالفرض اس کا احتمال مان بھی لیا جائے تو منطق کے اعتبار سے جہاں احتمال پیدا ہوتا ہے وہاں دو امکانات پیدا ہوتے ہیں اور اس صورت میں وہ دلیل دونوں طرف سے ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے۔

ایک درجے میں یہ بات اس حد تک تسلیم کی جا سکتی ہے کہ جو بھی حضور ﷺ کے ساتھ تھا وہ صحابی نہیں تھا' منافقین بھی تو تھے' جو ظاہری طور پر ساتھ تھے۔ آخر وہ مسجد نبویؐ میں حضور ﷺ کے ساتھ نمازیں پڑھتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ جب امتحان کا کڑا وقت آتا تھا تو ﴿يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا﴾ کے مصداق وہ کھسک جاتے تھے۔ لیکن بہرحال نمازوں میں تو موجود رہتے تھے' اس لیے کہ اس میں تو کوئی جان و مال کی مصیبت نہیں آتی تھی۔ البتہ نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو کسل مندی کے ساتھ۔ طبیعت میں آمادگی نہیں ہوتی تھی' انشراح اور ابتہاج کی کیفیت سے محروم تھے کہ دل کی کلی کھلی ہوئی ہو اور اللہ سے لو لگی ہوئی ہو' جس کو حضور ﷺ نے فرمایا ہے: ((جُعِلَ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ))[1] "میری تو آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے"۔

(۱) سنن النسائی' کتاب عشرة النساء' باب حبّ النساء۔

جہاں کہیں آپؐ کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تھا' کسی چیز پر غور و فکر کرنے کی حاجت ہوتی تھی تو آپؐ فوراً نماز کی طرف رجوع کرتے تھے۔ تو معلوم ہوا کہ نماز تو کلید مسائل ہے۔ نماز مؤمنوں کے لیے معراج کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن منافقین کی نماز کی کیفیت قرآن حکیم میں یوں بیان کی گئی ہے: ﴿وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ......﴾ (النساء: ۱۴۲) "اور جب وہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے (کسل مندی کے ساتھ) محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر"۔ لیکن بہرحال ظاہری طور پر تو وہ اس جماعت میں موجود تھے۔ بلکہ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کا یہ حال تھا کہ جب بھی حضور ﷺ کوئی خطبہ ارشاد فرماتے تو اس سے پہلے اپنی حیثیت کے اظہار کے لیے کھڑا ہو کر اعلان کیا کرتا تھا کہ لوگو! یہ اللہ کے رسولؐ ہیں' ان کی بات توجہ سے سنو اور مانو! منافقین کے ظاہر و باطن کا یہی تضاد تھا جسے سورۃ المنافقون میں بایں الفاظ بیان کیا گیا:

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱﴾

''(اے نبیؐ!) جب یہ منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ ہاں! اللہ جانتا ہے کہ آپؐ اس کے رسول ہیں، لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یقیناً یہ منافقین جھوٹے ہیں''۔

تو اس اعتبار سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی ظاہری معیت تو منافقین کو بھی حاصل تھی، لیکن دل کی سچائی، راست بازی اور خلوص و اخلاص کے ساتھ حضور ﷺ کی معیت صرف صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم اجمعین) کو حاصل تھی۔ گویا آنحضور ﷺ کے ساتھ جو جماعت تھی اس میں چند کالی بھیڑیں بھی تھیں۔ اب اس میں معاملہ نسبت تناسب کا ہو جائے گا۔ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ اس میں کالی بھیڑوں کی اکثریت تھی تو وہ بتائے کہ پھر عالمِ واقعہ میں یہ تحریک کامیاب کیسے ہوئی؟ یہ ناممکن ہے، محالِ عقلی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جماعت میں مؤمنین صادقین کی عظیم اکثریت تھی، البتہ کچھ کالی بھیڑیں بھی تھیں، تب ہی تو یہ جدوجہد کامیاب ہوئی ہے، ورنہ کفر کی ساری شیطانی قوتیں اس کی ناکامی پر ادھار کھائے بیٹھی تھیں۔

بہرحال اس مقام پر ایک حرف ''مِـــن'' کی بنیاد پر یہ کہہ دینا کہ اس جماعت میں بس چند ہی صاحب ایمان اور مخلص تھے، باقی سب کے سب منافقین تھے (معاذ اللہ)، یہ میرے نزدیک بالبداہت غلط ہے، اور سوائے ان لوگوں کے جو مسلوب التوفیق ہو چکے اور کسی وجہ سے اللہ کی درگارہ سے راندۂ درگاہ ہو چکے، کوئی شخص نہ دل سے اس بات کا قائل ہوسکتا ہے اور نہ زبان سے اس کا اظہار کرسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو اپنے رسول ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم اجمعین) کی محبت سے معمور فرمائے اور ہماری ہدایت میں اضافہ فرمائے۔ آمین!

---

(۲)

نحمدهٗ ونصلّی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعدُ:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗٓ لا اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ ز یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ ط ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۵۴﴾﴾ (المائدۃ)

سورۃ الفتح کی آخری آیت میں اُن لوگوں کے اوصاف بیان ہوئے ہیں جو اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے کمر کس لیں اور غلبۂ دین کے لیے میدان میں اتریں۔ وہی مضمون نہایت جامعیت کے ساتھ اور اِک ذرا مختلف اسلوب میں سورۃ المائدۃ کی اس آیت میں آ رہا ہے۔ بلکہ یہاں ایک اضافی حسن سامنے آئے گا۔ میں نے وہاں اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف کے تین اَبعاد (3-dimensions) مکمل کرنے کے لیے سورۃ الصّف سے مدد لی تھی کہ ان تین اَبعاد میں سے ایک سورۃ الصّف کی اس پکار میں سامنے آتا ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ط﴾ یعنی اللہ کی راہ میں مال کا خرچ کرنا اور جان کا کھپانا (انفاقِ مال اور بذلِ نفس) ان کے اوصافِ ثلاثہ میں سے پہلا وصف ہے۔ دوسرا اُن کا یہ وصف ہے کہ کفار کے مقابلے میں بہت سخت ہیں جبکہ آپس میں بہت رحیم ہیں۔ ﴿اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ﴾۔ ان کا تیسرا خصوصی وصف تعلق مع اللہ ہے۔ ﴿تَرٰىھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا ز﴾ گویا کہ وہ آیت مبارکہ جو سورۃ الصّف میں آئی ﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ ﴿۹﴾﴾ تو ان اَبعادِ ثلاثہ میں سے ایک dimension تو اس کے ساتھ متصل ہو کر آ گئی اور بقیہ دو ﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ط وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا ﴿۲۸﴾﴾ کے ساتھ متصل ہو کر آ گئیں۔ سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۴ میں آپ دیکھیں گے کہ یہ تینوں یکجا ہیں۔ گویا کہ مضمون وہی ہے لیکن یہاں مزید جامعیت ہے اور اس میں ایک اضافی حسن موجود ہے۔

مسلمانوں سے قرآن حکیم کا اندازِ خطاب

ارشاد ہوا: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''اے ایمان والو!'' یا بالفاظِ دیگر ''اے ایمان کے دعوے دارو!'' میرے دروس میں بار بار یہ بات آ چکی ہے کہ قرآن مجید میں ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کا صیغۂ خطاب مسلمانوں کے لیے ہے۔ اب مسلمانوں میں مؤمنین صادقین بھی شامل ہیں اور منافقین بھی۔ مسلمانوں میں عزیمت اور ہمت والے بھی شامل ہیں اور رخصتوں پر چلنے والے بھی۔ مسلمانوں میں ضعفاء بھی ہیں اور قوی بھی۔ میرا ذہن حضور ﷺ کی اس حدیث کی طرف منتقل ہوا ہے: ((اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ وَاَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ))[1] ''وہ مؤمن جو قوی ہو' ضعیف مؤمن سے بہتر ہے اور اللہ کو زیادہ محبوب ہے''۔

(۱) صحیح مسلم' کتاب القدر' باب فی الامر بالقوۃ و ترک العجز والاستعانۃ باللہ۔

اب یہ قوت اور ضعف بھی سمجھ لیجیے کہ ایک ظاہری ہوتا ہے اور ایک باطنی۔ ظاہر بات ہے کہ انسان کے جسم و جان میں ظاہری توانائیاں بھی درکار ہیں' تب ہی وہ محنت کر سکے گا' بھاگ دوڑ کر سکے گا۔ مقابلہ پیش آئے گا تو اُس میں بھی قوت و توانائی کی ضرورت ہوگی۔ لیکن ایک انسان کی باطنی قوت یعنی قوتِ ارادی ہوتی ہے جس کو ہم ہمت و عزیمت کہتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کا تن و توش تو بہت ہے' گوشت اور چربی کا منوں وزن موجود ہے' لیکن ہمت نام کو موجود نہیں ہے' اور بسا اوقات آپ کو نظر آئے گا کہ جسم بہت ہی لاغر اور بہت ہی نحیف و ناتواں ہے' لیکن اندر جو ہمت و عزیمت ہے وہ کوہِ ہمالہ کے مانند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بار ہا قرآن مجید میں حضور ﷺ سے خطاب فرماتے ہوئے منافقین کے بارے میں کہا گیا کہ اے نبیؐ! آپؐ ان کے تن و توش سے متأثر نہ ہوں۔ ﴿وَاِذَا رَاَیْتَھُمْ تُعْجِبُکَ اَجْسَامُھُمْ﴾۔ اس کے برعکس دیکھئے کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ ضعیف و ناتواں' رقیق القلب انسان تھے' لیکن ان میں ہمت و عزیمت جس درجے کی تھی وہ خاص طور پر حضور ﷺ کے انتقال کے بعد ظاہر ہوئی کہ جس قسم کے حالات یک دم پیدا ہوئے اور جس طرح سے ہر طرف سے ایک طوفان اٹھا اس طوفان میں حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے جس طرح کی عزیمت کا ثبوت دیا اس میں یقیناً حضرت عمر ؓ بھی ان سے بہت پیچھے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے بھی مصلحت کا مشورہ دیا تھا کہ کم سے کم مانعین زکوٰۃ کے ساتھ ایک نیا محاذ نہ کھول لیے۔ تو اصل میں ہر اعتبار سے قوی اور ضعیف مسلمانوں میں تو

گڈمڈ ہیں' لہٰذا جب قرآن مجید میں ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کے الفاظ سے خطاب ہوتا ہے تو وہاں یہ معین کرنا پڑتا ہے کہ روئے سخن اصلاً کن کی طرف ہے۔ کہیں وہ مؤمنین صادقین کی طرف ہوتا ہے اور کہیں اصلاً اُس وقت مخاطَب منافق ہوتے ہیں' لیکن ان سے بھی قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ نَافَقُوْا'' بلکہ ان سے بھی خطاب ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کہہ کر ہی کیا جاتا ہے' کیونکہ درحقیقت قانوناً وہ بھی مسلمان ہیں اور ایمان اور اسلام کے دعوے دار ہیں۔ اس لیے کہیں کہیں میں ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کا ترجمہ ''اے ایمان کا دعویٰ کرنے والو!'' کیا کرتا ہوں' جس کو ترجمہ نہیں ترجمانی کہنا چاہیے۔

ارتداد کا مفہوم اور اس کی اقسام

فرمایا: ﴿مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ﴾ ''جو کوئی لوٹ گیا تم میں سے اپنے دین سے''۔ ارتداد کے لفظ کو سمجھ لیجیے۔ رَدَّ' یَرُدُّ کے معنی ہیں لوٹا دینا۔ اسی سے لفظ مردود ہے' یعنی لوٹایا ہوا' جس کو اللہ تعالیٰ کی جناب سے دھکے دے دیے گئے' راندۂ درگاہِ حق۔ اس سے بابِ افتعال میں ''ارتداد'' بنا۔ ارتداد کے معنی ہوں گے خود لوٹ جانا' خود پھر جانا' پسپائی اختیار کرنا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ابھی میں نے قوت وضعف کا ذکر کیا کہ ایک ظاہری ہے ایک باطنی ہے۔ اسی طرح ایمان سے پسپائی بھی ایک ظاہری ہے ایک باطنی۔ ظاہری پسپائی یا علی الاعلان پسپائی کو ہم عرفِ عام میں یا اصطلاح میں ارتداد کہتے ہیں۔ ایک شخص کھلم کھلا اسلام سے انحراف کا اعلان کر کے کوئی اور مذہب اختیار کر لیتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ مرتد ہو گیا۔ حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا اپنے جس مسلمان شوہر کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ گئی تھیں وہ وہاں جا کر عیسائی ہو گیا تھا۔ یہ بالکل ابتدائے اسلام میں ارتداد کا واقعہ ہے۔ پھر جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا آخری دَور ہے اس میں ارتداد شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ نئی نبوت کے دعوے دار صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد کھڑے نہیں ہوئے تھے بلکہ آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری دور میں یہ فتنہ سر اٹھا چکا تھا۔ کچھ طالع آزما قسم کے لوگوں نے یہ دیکھا کہ نبوت کی بنیاد پر محمدؐ کی دکان تو خوب چمک گئی (معاذ اللہ) اور انہوںؐ نے کیا کچھ حاصل کر لیا' تو ''آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی!'' کے مصداق اگر ہم بھی نبوت کا دعویٰ کریں تو شاید ہمارا دھندا بھی چمک جائے۔ جن کور باطن لوگوں نے اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دھندا سمجھا تھا انہوں نے اپنا دھندا جمانے کی کوشش کی۔ اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہی میں ہوا۔

تو ایک ارتداد ہے اسلام سے علی الاعلان' کھلم کھلا انحراف' کسی اور نبوت کا اقرار یا کسی اور مذہب کو قبول کر لینا۔ اسلام میں اس قسم کے مرتد کی سزا قتل ہے۔ البتہ ایک باطنی ارتداد ہے کہ آدمی اندر ہی اندر مرتد ہو گیا ہو۔ گویا انڈے کے اندر جو کچھ تھا چوزہ تو بن چکا ہے مگر ابھی خول ٹوٹا نہیں ہے۔ قانون کے اعتبار سے تو ظاہر ہے کہ جب تک وہ خول نہیں ٹوٹتا اس وقت تک وہ مسلمان شمار ہو گا۔ اندر سے انسان کافر ہو چکا ہو اور قانونی اعتبار سے ظاہراً مسلمان ہو تو یہ باطنی ارتداد ہے جس کو ہم نفاق کہتے ہیں۔ منافق حقیقت میں کافر تو ہو چکا لیکن قانوناً وہ مسلمان رہتا ہے۔ سورۃ المنافقون میں' جو ہمارے منتخب نصاب (ا) میں شامل ہے' الفاظ آئے ہیں: ﴿ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا......﴾ ''یہ اس لیے ہوا کہ وہ ایمان لائے تھے' پھر انہوں نے کفر کیا......'' لیکن یہ کفر کون سا تھا؟ یہ اعلانیہ کفر نہیں تھا' بلکہ اندر ہی اندر کا کفر تھا۔

سورۃ المائدۃ کی زیرِ نظر آیت کے سمجھنے میں یہی لفظ ''ارتداد'' رکاوٹ بن گیا ہے' کیونکہ اس کا جو بھی عام مفہوم ہے' یعنی قانونی اور ظاہری ارتداد' اکثر لوگوں نے اسی پر اس کو محمول کر لیا ہے' حالانکہ غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یہ مفہوم نہیں ہے' بلکہ باطنی پسپائی یعنی نفاق مراد ہے جس میں انسان اندر ہی اندر لوٹ رہا ہوتا ہے۔ میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں کہ نفاق کی دو قسمیں ہیں' ایک شعوری اور ایک غیر شعوری۔ یعنی آدمی اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہوتا ہے جبکہ اسے خود پتا نہیں ہوتا کہ میں کھوکھلا ہو چکا ہوں اور ایک یہ کہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ میں اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہوں' میں نے لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے اسلام کا صرف لبادہ اوڑھ رکھا ہے' حقیقت میں اندر سے میں بدل چکا ہوں۔

نفاق کے مراحل ومدارج

غیر شعوری پسپائی یا نفاق کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ سب سے پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی کی ہمت جواب دینے لگتی ہے کہ اسلام کے تقاضے تو بڑے کٹھن ہیں' یہ تو قدم قدم پر کہتا ہے کہ لاؤ جان حاضر کرو' آؤ نکلو اللہ کی راہ میں نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر۔ یہ معاملہ تو بہت مشکل اور کٹھن ہے۔ اب یہاں سے وہ پسپائی شروع ہو گئی۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ یہ معاملہ تو وہ ہے کہ یا تو آپ آگے بڑھیے' ورنہ آپ پیچھے ہٹنا شروع ہو جائیں گے' اس لیے کہ ع ''سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں!'' ایک آدمی پیش قدمی کر رہا ہے' آگے بڑھ رہا ہے۔ ع ''ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم!'' لیکن کسی وجہ سے ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا کہ نہیں بھائی' آگے خطرہ ہے' آگے مشکلات ہیں۔ تو اب یہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو جانا اس کو کھڑا نہیں رہنے دے گا' بلکہ اب ریورس گیئر لگے گا اور وہ لامحالہ پیچھے کی طرف پسپائی شروع کر دے گا' البتہ ابتدائی مرحلہ میں اس کا اعتراف ہو گا کہ میری کمزوری ہے' میں کمزور آدمی ہوں' مجھ سے خطا ہو گئی' میری معذرت قبول کی جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایسے لوگ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اعتراف کرتے اور درخواست کرتے کہ حضورؐ مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے' آپؐ خود بھی مجھے معاف فرمائیں اور اللہ تعالیٰ سے بھی میرے لیے استغفار کریں۔ اس کو نفاق نہیں کہیں گے' یہ صرف ضعفِ ایمان ہے۔ لیکن اس

سے اگلے مرحلے میں اب آدمی جھوٹے بہانے بنانا شروع کرتا ہے‘ اپنے طرزِ عمل کی عقلی توجیہہ پیش کرتا ہے اور اس کی justifications دیتا ہے کہ نہیں جی‘ یہ بات نہیں تھی‘ مجبوری تھی‘ میں تم سے کوئی کم نہیں ہوں‘ یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنے جذبے میں کمی کی وجہ سے پیچھے رہ گیا‘ بلکہ میری مجبوری تھی‘ حالات ہی کچھ ایسے تھے۔ اب جب یہ جھوٹ شروع ہوا تو یوں سمجھ لیجیے کہ ایسے شخص نے ضعفِ ایمان سے آگے بڑھ کر نفاق کی سرحد میں قدم رکھ دیا۔ یہ گویا نفاق کی پہلی سٹیج ہے۔

نفاق کی دوسری سٹیج تب آتی ہے کہ جب انسان محسوس کرتا ہے کہ جھوٹ بول بول کر اب تو حال یہ ہو گیا ہے کہ میرا اعتبار اٹھ گیا ہے‘ تو اب وہ اپنے جھوٹ کو جھوٹی قسم سے زیادہ مؤکد کرتا ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿اِتَّخَذُوْۤا اَیْمَانَهُمْ جُنَّةً﴾ ”انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنالیا ہے“۔ اب ان کا طرزِ تکلم یہ ہوتا ہے کہ خدا کی قسم! یہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں صحیح ہے‘ مجھے واقعتاً مجبوری لاحق تھی۔

نفاق کی تیسری سٹیج وہ آتی ہے کہ جب انسان یہ سمجھتا ہے کہ میرا راز اب طشت از بام ہو چکا ہے‘ اب میری قسموں کا بھی اعتبار اٹھ گیا ہے‘ تو اب طبیعت میں ایک جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی ہے اور جو لوگ اللہ کے دین کے راستے میں اپنے مال و جان قربان کرتے ہوئے سیدھے آگے بڑھ رہے ہوتے ہیں ان سے ایک بغض وعناد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ انہوں نے ہمارے لیے مصیبت ڈالی ہوئی ہے‘ یہ آگے بڑھتے ہیں تو ہمارا پیچھے رہنا نمایاں ہو جاتا ہے‘ اگر یہ بھی آگے نہ بڑھیں‘ سب بیٹھے رہیں تو سب برابر رہیں‘ ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے‘ یہ fanatics ہیں‘ جنونی ہیں‘ پاگل ہیں‘ سُفَهَاء ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ﴾ ”اور جب ان (منافقوں) سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں: کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں؟“ یہ تو بے وقوف لوگ ہیں‘ انہیں اپنے خیر اور شر کا پتا نہیں‘ نفع ونقصان کی فکر نہیں‘ ہم تو ایسے پاگل اور بے وقوف نہیں ہیں۔ یہ تیسری اور آخری سٹیج ہے‘ یہ تباہی اور بربادی کی وہ سرحد ہے کہ جس سے اب واپسی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

دین کے تقاضوں سے گریز کا انجام

اصل میں یہی پسپائی ہے جو یہاں (سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۴ میں) زیر بحث ہے۔ خبردار (warn) کیا جا رہا ہے کہ دیکھو کہیں اندر ہی اندر ضعفِ ایمان میں مبتلا ہو کر نفاق کے راستے پر نہ پڑ جانا۔ اب فرض کیجیے کہ کوئی شخص پہلی سٹیج پر ہے تو متنبہ ہو جائے اور واپس لوٹ آئے اس راستے کی طرف کہ ہر چہ بادا باد! اگر دوسری سٹیج پر ہے تب بھی واپسی کا امکان ہے‘ لیکن اگر تیسری سٹیج پر پہنچ گئے تو اب وہ ”point of no return“ ہے‘ پھر وہاں سے لوٹنے کا امکان نہیں رہے گا۔ اس لیے آگاہ کیا جا رہا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ......﴾ ”اے ایمان کے دعوے دارو! جو کوئی بھی لوٹ گیا تم میں سے اپنے دین سے......“ یعنی اپنے دین کے تقاضوں کو ادا کرنے سے گھبرا گیا—— ذرا اپنے باطن میں نظر ڈالو‘ اپنے گریبانوں میں جھانکو! اگر یہ محسوس کرو کہ پسپائی کے عمل کا آغاز ہو گیا ہے تو فوراً ہوش میں آ جاؤ۔ یہاں کلام میں حذف کا اسلوب ہے کہ جو بھی تم میں سے پیچھے پھر جائے گا وہ یہ نہ سمجھے کہ وہ اللہ کا کچھ بگاڑ لے گا۔ یہ مفہوم یہاں پر محذوف یا مقدر (understood) ہے۔ تمہارے پھر جانے سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑے گا‘ اس لیے کہ اللہ تو کسی اور کو اٹھا لائے گا‘ وہ کسی اور کو یہ سعادت عطا فرما دے گا۔ وہ تو ایک سعادت تھی جو اللہ نے تمہیں عطا فرمائی تھی ؎

منّت مِنہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی
منّت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

”تم اپنا احسان نہ دھرو کہ تم بادشاہ کی خدمت کر رہے ہو‘ بلکہ بادشاہ کا احسان مانو کہ اس نے تمہیں اپنی خدمت کا موقع عنایت فرمایا“۔

یہ تو ایک سعادت تھی کہ اللہ نے تمہیں چن لیا‘ تمہیں پسند فرما لیا‘ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ۔ لیکن اب اگر تم اس سے دستبردار ہو رہے ہو‘ پسپائی اختیار کر رہے ہو‘ کم ہمتی کا اظہار کر رہے ہو تو اس سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑے گا‘ اللہ تمہاری جگہ کسی اور کو اٹھا دے گا‘ وہ پوری کی پوری قوم کو ختم کر کے کسی نئی قوم کو اپنے دین کا جھنڈا تھما سکتا ہے۔ وہ تو پوری نوعِ انسانی کو ختم کر کے ایک بالکل نئی نسل پیدا کر سکتا ہے۔ افراد کو ہٹا کر ان سے بہتر افراد لا سکتا ہے۔ لہٰذا اس میں سارا نقصان تمہارا اپنا ہے‘ اللہ کا نہ کوئی گھاٹا ہے اور نہ نقصان ہے۔

اقامت دین کی جدوجہد کے لیے مطلوبہ اوصاف

فرمایا: ﴿فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ﴾ ”تو عنقریب اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو لے آئے گا“۔ اب اس قوم کے کیا اوصاف ہوں گے؟ وہ آپ کو یہاں تین dimensions نظر آ جائیں گی۔ گویا کہ بالواسطہ تلقین ہو رہی ہے کہ اگر اس راستے پر چلنا ہے تو تمہیں یہ تین اوصاف اپنے اندر پیدا کرنے ہوں گے۔ یہ اصل میں مؤمنین صادقین کے تین اوصاف کا بیان ہے:

﴿يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ز يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ط﴾ ''(۱) جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا۔ (۲) جو اہل ایمان پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے۔ (۳) جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے''۔

یہاں ذرا ترتیب اور اسلوب بدلتا ہے۔ گزشتہ صفحات میں ہم نے دیکھا کہ سورۃ الصّف کے حوالے سے پہلے جہاد کا ذکر آیا تھا' لیکن یہاں جہاد آخر میں ہے۔ پھر سورۃ الفتح میں پہلے یہ وصف بیان ہوا: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾۔ یہاں اس کا ذکر بھی بعد میں ہے: ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾۔ وہاں ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ پہلے ہے ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ بعد میں ہے' جبکہ یہاں ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ پہلے ہے اور ﴿اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ بعد میں ہے۔

پھر وہاں ﴿تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا﴾ کے الفاظ میں تعلق مع اللہ کا وصف آخر میں بیان کیا گیا' یہاں آغاز اس وصف سے کیا جا رہا ہے' لیکن اس کے لیے الفاظ مختلف ہیں: ﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ﴾ ''جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا''۔ یہ ہے اللہ اور بندے کے مابین باہمی محبت کا ایک رشتہ۔ عجیب بات ہے کہ وہاں اس تعلق مع اللہ کی صرف ایک جہت بیان ہوئی کہ وہ نماز پڑھتے ہیں۔ ﴿تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ز﴾ یہاں اس تصویر کا دوسرا رُخ نمایاں کیا گیا اور اس کا ذکر پہلے لایا گیا۔ اس لیے کہ اللہ اور بندے کے مابین جو بھی نسبت وتعلق ہے وہ دوطرفہ ہے۔ بندہ اللہ سے محبت کرتا ہے تو اللہ بھی بندے سے محبت کرتا ہے۔ بندہ اللہ کو یاد کرتا ہے تو اللہ بھی بندے کو یاد کرتا ہے۔ ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ ''تم مجھے یاد رکھو' میں تمہیں یاد رکھوں گا''۔ اور حدیث قدسی میں (جو متفق علیہ ہے) اس کی نہایت پیاری شرح آئی ہے کہ میرا بندہ اگر مجھے اپنے جی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں اور میرا بندہ اگر کسی محفل میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں بھی اس سے کہیں اعلیٰ محفل میں اس کا ذکر کرتا ہوں (یعنی اللہ تعالیٰ ملأ اعلیٰ اور ملائکہ مقربین کی محفل میں اس بندے کا ذکر فرماتا ہے)۔ اور اگر میرا بندہ بالشت بھر مجھ سے قریب ہوتا ہے تو میں ہاتھ بھر اس سے قریب ہوتا ہوں۔ اور اگر میرا بندہ چل کر میری طرف آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ تو یہ تعلق مع اللہ کا معاملہ یک طرفہ نہیں ہے بلکہ دوطرفہ ہے۔ قرآن حکیم میں فرمایا: ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا''۔ اسی طرح کا معاملہ ولایتِ باہمی کا ہے کہ جو اہل ایمان اللہ کے ولی ہوتے ہیں اللہ ان کا ولی ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ط﴾ (البقرۃ: ۲۵۷) ''اللہ اہل ایمان کا حامی و مددگار ہے' وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال کر لاتا ہے''۔ اور: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾﴾ (یونس) ''آگاہ رہو! یقیناً جو اللہ کے دوست ہیں ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے''۔ تو یہ موالاتِ باہمی ہے کہ تم میرے دوست بنو تو میں تمہارا دوست ہوں۔ اس اعتبار سے نوٹ کیجیے یہ بڑا پیارا مقام ہے: ﴿يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ﴾ ''اللہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اللہ سے محبت کریں گے''۔

اس جگہ ایک بڑی لطیف بات آئی ہے جو درحقیقت صوفیاء کا موضوع ہے کہ ان مطلوبہ اوصاف میں سب سے پہلے اللہ کی محبت کا ذکر ہوا ہے۔ اصل میں یہ اللہ کا سلیکشن ہے۔ یہ جان لیجیے کہ پہلے اللہ اپنے کسی بندے کو چنتا ہے اور اس کا چناؤ (selection) ہی اس بندے کے لیے کل خیر کی توثیق کا اصل سبب بنتا ہے۔ اہل جنت کی زبانوں پر جو ترانۂ حمد ہوگا اس میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ﴿وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ﴾ ''ہم ہرگز ہدایت نہ پاسکتے اگر اللہ ہمیں ہدایت نہ دیتا''۔ گویا اس نے ہمیں چنا ہے۔ سورۃ الحج کے آخری رکوع میں ارشاد ہوا: ﴿هُوَ اجْتَبٰىكُمْ﴾ ''اس نے تمہیں چن لیا ہے''۔ اب اس میں جو سرور اور کیف ہے یہ سرور دنیا کی بڑی سے بڑی مشکل کو آسان کردے گا۔ یہ کیف وہ ہے کہ دنیا کی کسی بڑی سے بڑی ظاہری نعمت میں وہ کیف اور سرور نہیں ہوگا کہ اللہ نے مجھے پسند فرمایا' اللہ کی نظرِ عنایت مجھ پر ہے' میں اللہ کی نگاہِ التفات میں ہوں (جیسے نبی اکرم ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا﴾ ''تم ہماری نگاہوں میں ہو!) مجھے خیر کی توفیق ملی ہے تو زہے نصیب کہ ع قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند! اب اس کیف کو اپنے اوپر طاری کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ یہ چیز انسان کے لیے استقامت کی کتنی بڑی بنیاد بنے گی۔ وہ جو اقبال کہتا ہے کہ ع ''اپنی خودی پہچان' او غافل افغان!'' اسی طرح بندہ اپنی اس حیثیت کا شعور وادراک کرے کہ میرے رب کا بلاوا میرے نام آیا ہے' مجھ تک یہ بات پہنچی ہے تو خود تو نہیں پہنچی' کسی کے پہنچائے پہنچی ہے' میرے دل میں نیکی کا یہ ارادہ پیدا ہوا تو از خود نہیں ہوا' اُسی کے پیدا کیے پیدا ہوا ہے۔ اور یہ درحقیقت محسوس کرنے کی شے ہے' اس کو الفاظ میں بیان کرنا بھی فی الواقع ممکن نہیں ہے۔ ﴿يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ﴾ ''اللہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اللہ سے محبت کریں گے''۔

اقامت دین کی جدوجہد میں اصل نصب العین اور اصل جذبۂ محرکہ یہی ہونا چاہیے۔ یہی ہوگا تو جدوجہد میں دوام ہوگا' ثبات ہوگا' استقامت ہوگی۔ اور اگر یہ نہیں ہے' بلکہ کوئی دنیاوی تبدیلی لے آنا' کوئی انقلاب برپا کر دینا' کوئی نظام درست کر دینا پیش نظر ہے' اور اسی کو کہیں نصب العین کا درجہ دے دیا تو مار کھا جائیں گے۔ پھر وہ استقامت حاصل نہیں ہوسکتی۔ استقامت کی اصل بنیاد یہی ''محبت خداوندی'' ہے۔ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ ''اور جو اہل ایمان ہیں وہ اللہ کی محبت میں بہت شدید ہیں''۔ یہ جذبۂ محبت موجود ہے تو گویا کہ رُخ صحیح ہوگیا اور انسان کا اصل جذبۂ محرکہ اب خالص ہوگیا۔ ورنہ ع ''گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!'' عبادت کے ضمن میں بھی میں آپ کو بتا چکا

ہوں کہ ''اَلْعِبَادَۃُ تَجْمَعُ اَصْلَیْنِ :غَایَۃَ الْحُبِّ مَعَ غَایَۃِ الذُّلِّ وَالْخُضُوْعِ ''یعنی ''عبادت کی دو بنیادیں ہیں: اللہ تعالیٰ سے انتہا درجے کی محبت اور اس کے سامنے انتہائی عاجزی اور پستی اختیار کرنا''۔

اب دوسرا وصف آیا: ﴿اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ﴾ ''مؤمنوں پر بہت نرم' کافروں پر بہت سخت''۔ یہی وصف سورۃ الفتح کے آخری رکوع میں بایں الفاظ بیان ہو چکا ہے: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ﴾ اس سے آپ اس کی اہمیت کا اندازہ کیجیے۔ یہ بار ہا کا بیان کردہ اصول ہے کہ اہم مضامین قرآن مجید میں کم سے کم دو مرتبہ ملتے ہیں اور ان میں اکثر و بیشتر ترتیب عکسی ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ الحج کے آخری رکوع میں شہادت علی الناس کے ضمن میں حضور ﷺ کا ذکر پہلے اور اُمت کا بعد میں ہے: ﴿لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ﴾ جبکہ سورۃ البقرۃ میں اُمت کا ذکر پہلے اور حضور ﷺ کا ذکر بعد میں آیا ہے: ﴿وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا ط﴾ (آیت ۱۴۳) یہ بات آپ کو قرآن حکیم میں اکثر و بیشتر ملے گی۔ مزید یہ دیکھئے کہ سورۃ الفتح میں ''اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ'' پہلے اور ''رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ'' بعد میں ہے' لیکن یہاں ''اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ'' پہلے اور ''اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ'' بعد میں ہے۔ ''اَذِلَّۃٍ'' جمع ہے ذلیل کی اور ''اَعِزَّۃٍ'' جمع ہے عزیز کی۔ ذلیل اور عزیز ایک دوسرے کے اضداد (antonyms) ہیں۔ لیکن ذلیل کا لفظ ہمارے ہاں جس معنی میں مستعمل ہے عربی میں اس کا اصلی مفہوم وہ نہیں ہے' بلکہ ذلیل کے معنی کمزور کے ہیں۔ گویا وہی بات جو میں نے گزشتہ درس میں علامہ اقبال کے شعر کے حوالے سے کہی تھی کہ ع

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

دوستوں کے لیے نہایت نرم خو۔ دوست جو فرمائش کر رہے ہیں ٹھیک ہے' قبول ہے۔ انہوں نے کوئی بات چاہی تو حاضر ہیں' کرنے کے لیے تیار ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے لیے بہت ہی نرم اور ڈھل جانے والے ہیں' موم کی طرح پگھل جانے والے ہیں۔ لیکن جب کفار سے مقابلہ ہوگا تو آہنی چٹان ثابت ہوں گے۔ وہاں محسوس ہوگا کہ یہ تو بڑے سخت ہیں' کوئی لالچ (temptation) ان کو ہلا نہیں سکتی' کوئی ایذا رسانی (persecution) انہیں ہراساں نہیں کر سکتی' کوئی ''نصیحت'' ان کے اوپر کارگر نہیں ہوتی۔ اس سے مراد اس طرح کی نصیحت ہے کہ خواہ مخواہ تم اپنا کیریئر کیوں برباد کر رہے ہو' اپنی زندگی کی فکر کرو' یہ تم کس راستے پر چل نکلے ہو۔ اس طرح کی بڑی بزرگانہ اور بڑی خیر خواہانہ انداز کی نصیحت بھی اثر انداز نہیں ہو رہی۔ دھمکی بھی اثر نہیں کر رہی۔

اسی وصف کو حضرت مسیح ؑ نے اپنے حواریین کو ہدایات دیتے ہوئے بڑے خوبصورت انداز میں یوں ادا کیا ہے کہ ''سانپ کی مانند ہوشیار لیکن فاختہ کی مانند بے ضرر بنو''۔ یعنی متضاد اوصاف کو بیک وقت جمع کرنا۔ سانپ بہت چوکس' چوکنا اور ہوشیار ہوتا ہے' لیکن وہ دوسرے کو ضرر بھی پہنچاتا ہے' اور فاختہ بے چاری بے ضرر ہے' لیکن ساتھ ہی بہت کمزور بھی ہے' اسے جو چاہے مار لے۔ تو یہ نہ ہو' فاختہ بھی نہ بنو اور سانپ بھی نہ بنو' لیکن سانپ کا ایک وصف تمہیں اپنے اندر لانا ہوگا' یعنی ہوشیار' چوکس' چوکنے رہنا ہوگا۔ کوئی تمہاری غفلت سے فائدہ نہ اٹھا جائے' کوئی تمہیں بھولا سمجھ کر تمہارے اس بھول پن کو exploit نہ کر جائے۔ لیکن تم سے کسی کو ضرر بھی نہ پہنچے۔ اس اعتبار سے تمہیں فاختہ کا وصف اپنانا ہو گا۔ اب یہ اپنی اضداد کے اعتبار سے بہت ہی بلیغ پیرایہ ہے۔ یہاں پر میں نے اس کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ تو ایک طرف نرمی ہے' جیسا کہ ہر وقت' ہر سانچے میں ڈھلنے کے لیے تیار' لیکن کس کے لیے؟ اہل ایمان کے لیے' اپنے ساتھیوں کے حق میں' اہل ایمان کے حق میں بہت نرم' لیکن مدّ مقابل یہ محسوس کرے کہ ان کے اندر تو انگلی دھنسانے کا بھی امکان نہیں ہے' کسی بھی درجے میں ان کو متاثر کر لینے کا کوئی امکان نہیں ہے' یہ تو چٹان کی طرح کھڑے ہوئے ہیں۔

تیسرا وصف وہ ہے جس کا ذکر سورۃ الصّف کے حوالے سے صفحاتِ گزشتہ میں کیا گیا تھا اور ہمارے اس منتخب نصاب (۱) میں وہ کما حقہٗ بیان ہو جاتا ہے' یعنی جہاد' اور جہاد میں جان و مال دونوں کا کھپانا۔ فرمایا: ﴿یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ ط﴾ ''وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے''۔ اب دیکھئے' قرآن مجید کا ایک اسلوب ہے' میں نے بھی کسی درجے میں اس اسلوب کو قرآن سے مستعار لیا ہے۔ چنانچہ میری تحریروں میں آپ کو یہ اسلوب ملے گا کہ اگر کچھ باتیں جوڑوں کی صورت میں آ رہی ہیں تو پھر جوڑوں ہی کی شکل میں بات آگے بڑھتی ہے۔ اس آیت میں ''یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ'' بھی ایک جوڑا ہے اور ''اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ'' بھی جوڑے ہی کی شکل ہے۔ لہٰذا اب جہاد کے ساتھ بھی ایک جوڑا لے آیا گیا: ﴿یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ ط﴾ ''وہ (ایسے لوگ ہوں گے کہ) اللہ کے راستے میں (اپنے جان و مال کے ساتھ) جہاد کریں گے اور (اللہ کے معاملے میں) کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہیں کریں گے''۔

اب یہ ملامت بھی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک ملامت وہ ہوتی ہے جو ڈانٹ ڈپٹ‘ شرم دلانے‘ غلطی پر متنبہ کرنے اور احمق قرار دینے پر مشتمل ہوتی ہے۔ یعنی یہ انداز کہ غلط جا رہے ہو‘ یہ صحیح راستہ نہیں ہے جو تم نے اختیار کیا ہے‘ تمہاری مت ماری گئی ہے‘ جبکہ ایک ملامت ناصحانہ ہوتی ہے کہ دیکھو کچھ فکر کرو‘ بال بچوں کا خیال کرو‘ کچھ اپنے مستقبل‘ اپنے کیریئر کا دھیان کرو‘ تمہارے والدین نے تمہیں کن ارمانوں کے ساتھ پالا پوسا‘ تم ان کے دل توڑ رہے ہو‘ آخر انہوں نے اپنا پیٹ کاٹ کر تم کو پڑھایا‘ اپنے اوپر سختیاں جھیلیں اور تمہاری ضرورتیں پوری کیں‘ اب تم ان کے ارمانوں کا خون تو نہ کرو۔ یہ ہے ایک ناصحانہ انداز۔ سورۃ العنکبوت کی آیت ۱۲ میں اسی ناصحانہ انداز کی طرف اشارہ ہے:
﴿وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوۡا سَبِیۡلَنَا وَلۡنَحۡمِلۡ خَطٰیٰکُمۡ﴾ ’’اور یہ کافر لوگ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمہاری خطاؤں کو ہم اپنے اوپر لے لیں گے‘‘۔ تو یہ دو طرح کی ملامت ہے جس سے اس راہ پر چلنے والوں کو سابقہ پیش آئے گا۔ بلکہ یہ ناصحانہ‘ مشفقانہ اور خیر خواہانہ ملامت زیادہ خوفناک ہوتی ہے۔ بسا اوقات انسان ڈانٹ ڈپٹ کے مقابلے میں تو اور سخت ہوتا چلا جاتا ہے‘ لیکن میٹھی چھری کے انداز میں جو کاٹ ہے اس سے بچنا زیادہ مشکل ہے۔ فیض کی شاعری چونکہ انقلابی رنگ لیے ہوئے ہے لہٰذا یہ چیز آپ کو وہاں بھی ملے گی ؎

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اِس عشق نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت!

تو غیروں کی طرف سے ناوکِ دشنام تو آئیں گے ہی‘ گالیاں آئیں گی‘ الزامات آئیں گے‘ مگر اپنوں کی طرف سے بھی ہر طرح کی ملامت برداشت کرنا پڑے گی۔ اب آپ اندازہ کیجیے کہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو ان کے کسی دوست نے حالتِ درویشی میں دیکھا ہوگا تو اُن سے کہا ہوگا کہ تم نے اپنے اوپر کیا ظلم کیا ہے‘ تمہارا دو دو سو درہم کا جوڑا سل کر آتا تھا‘ تمہارا پورا لباس معطر ہوتا تھا‘ تم خوش لباسی اور خوش ذوقی کی ایک علامت بن گئے تھے‘ جدھر سے تم گزرتے تھے وہ گلیاں معطر ہو جاتی تھیں‘ لوگوں کی نگاہیں اٹھتی تھیں—اور اب تم اس پھٹے پرانے کمبل کے اندر ملبوس ہو جس میں پیوند لگے ہوئے ہیں! حضرت مصعب بن عمیرؓ کا انتقال اس حالت میں ہوا تھا کہ ان کے جسم پر چادریں بھی دو نہیں تھیں‘ صرف ایک چادر تھی۔ اس تہہ بند کے ساتھ وہ اللہ کا بندہ لڑ رہا تھا‘ اور وہ تہہ بند بھی اتنا تھا کہ جب شہادت ہوگئی تو پورے جسم کو ڈھانپ نہیں سکا‘ سر کو ڈھانپتے تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں کو ڈھانپتے تو سر کھل جاتا۔ حضورﷺ کے سامنے یہ معاملہ پیش کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ سر کو چادر سے ڈھانپ دو اور پیروں پر گھاس ڈال دو۔ تو وہ کہاں سے کہاں پہنچے! از کجا تا بہ کجا! اور یہ سب کچھ ایک دن میں تو نہیں ہوگیا۔ اس کو یوں سمجھئے کہ کم وبیش دس گیارہ برس لگے۔ مکہ میں قبولِ اسلام کے بعد جب انہیں مادر زاد برہنہ کر کے گھر سے نکالا گیا تو اُس وقت ان کے دوستوں کا جو حلقہ ہوگا‘ انہوں نے کس انداز میں ملامت کی ہوگی۔ چچا نے یہ کہتے ہوئے گھر سے نکال دیا کہ تم نے اپنے باپ کا دین چھوڑ دیا ہے تو اس کی جائیداد اور اس کی چھوڑی ہوئی دولت پر بھی تمہارا کوئی حق نہیں۔ گھر سے نکلنے لگے تو چچا نے کہا کہ یہ لباس بھی اسی باپ کی کمائی کا ہے جو تم نے پہنا ہوا ہے‘ تم نے تو آج تک پھوٹی کوڑی نہیں کمائی‘ یہ تو باپ کی چھوڑی ہوئی دولت ہے جس پر تم آج تک گلچھرے اڑاتے رہے ہو۔ اس نے بدن کے کپڑے بھی اتروا کر مادر زاد برہنہ کر کے گھر سے نکال دیا۔

رہی ناصحانہ اور خیر خواہانہ اندازِ ملامت تو یہ زیادہ خطرناک ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ پر ایک دورِ ابتلاء تو وہ تھا کہ ان کو ماریں پڑ رہی تھیں‘ ایسی مار کہ اگر ہاتھی کو ماری جائے تو وہ بلبلا اٹھے‘ مگر اس پر کبھی کوئی آنسو آپؒ کی آنکھ میں نہیں آیا۔ جب دربارِ خلافت کی صورتِ حال بدلی‘ وہ فتنے والا دَور ختم ہوگیا‘ تختِ خلافت پر متمکن ہونے والے نئے خلیفہ نے اشرفیوں کا ایک توڑا بھیجا تو اس کو دیکھ کر رو پڑے اور کہا کہ اے اللہ! میں اس آزمائش کے قابل نہیں ہوں۔ یہ آزمائش زیادہ بھاری ہے ان کوڑوں سے جو میری پیٹھ پر پڑ رہے تھے۔ تو یہ ہے وہ وصف مطلوب ﴿لَا یَخَافُوۡنَ لَوۡمَۃَ لَآئِمٍ﴾ کہ وہ کسی ملامت گر کی ملامت کا خوف نہ کریں گے۔

یہ ان لوگوں کے مطلوبہ اوصاف کی تین dimensions ہیں‘ جو دراصل ہمارے لیے تین کسوٹیاں ہیں۔ اقامت دین کی جدوجہد کے لیے مطلوبہ اوصاف کے حوالے سے یہ وہ آئیڈیل ہے جو ہمیں پیش نظر رکھنا ہے۔ اگر ہم اس معیار پر اپنے آپ کو پورا نہیں پا رہے ہیں تو اپنی کوتاہی کا احساس رہے‘ اس کا اعتراف ہو اور اس کا اقرار رہے‘ لیکن آئیڈیل کو مسخ نہ کیا جائے۔ اگر ہم اس آئیڈیل کو بدل دیں گے تو پھر اصلاح کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔ تو ان مقامات کو اس اعتبار سے مستحضر رکھنا ضروری ہے کہ یہ اس راہ کے مسافروں کے لیے زادِ راہ ہے‘ یہ اس جدوجہد کے لیے کمر ہمت کسنے والوں کے لیے لازمی اوصاف ہیں۔

آ گے فرمایا:﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ ''یہ اللہ کا فضل ہے' وہ جسے چاہے عطا کرتا ہے''۔لفظ ''فضل'' کے مفہوم اور قرآن مجید میں اس کے استعمالات پر ہم گزشتہ نشست میں گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں ''فضل'' کا استعمال ایک نئی شان سے ہوا ہے۔ اس کا تعلق ''يُحِبُّهُمْ'' سے جڑتا ہے' یعنی اللہ کا یہ فضل ہوا تو انسان اس راستے کی طرف آیا۔ پھر یہ کہ ان اوصاف میں جتنی جتنی بھی ارزانی ہوئی وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کرنے ہی سے ہوئی۔ یہ اللہ کا فضل ہے' جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ اُسی نے چنا اگر کسی کو چنا' اُسی نے ذوق عطا فرمایا اگر عطا فرمایا' اُسی نے شوق عطا فرمایا اگر شوق ملا' اُسی نے جذبہ عطا کیا اگر کسی کو جذبہ ملا۔ کوئی اور ذریعہ (source) تو ہے ہی نہیں۔ تو یہ چیزیں اللہ کے فضل میں سے ہیں۔﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے' اس کی دین ہے' اس کی عطا ہے۔ پھر اس کو نوٹ کیجیے کہ یہ اگر احساس رہے گا تو انسان میں کبھی تکبر پیدا نہیں ہوگا۔ پہلی بات تو یہ کہ اس میں ایک سرور ہے' اس میں کیف ہے کہ میرے ربّ نے مجھے چنا ہے' میرے ربّ نے مجھے پسند فرمایا ہے۔ قرعۂ فال میرے نام نکلا ہے۔ تو اس میں عنایت خداوندی کا اپنی ذات پر جو ایک خاص احساس ہوتا ہے یہ انسان کے لیے قوت کا سب سے بڑا منبع اور سرچشمہ ہے۔ پھر یہی وہ چیز ہے کہ جو تکبر کا راستہ مسدود کرتی ہے۔ اگر اس کے برعکس صورت ہو کہ میں نے یہ کیا' میرے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوئی' تو جان لیجیے کہ یہی ''مَیں'' ہے جو اصل میں کِبر اور تکبر کی شکل اختیار کرتی ہے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ شیطان کے وار سب پر ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ جو لوگ اس وادی میں آ گئے ہوں اور وہ کچھ منزلیں طے بھی کر بیٹھے ہوں' کچھ امتحانات پاس بھی کر چکے ہوں' کچھ آزمائشوں سے کامیابی کے ساتھ نکل بھی آئے ہوں' اب ان پر شیطان کا کوئی اور وار کارگر نہیں ہوگا' ان کے لیے شیطان کے پاس بہت بڑا ہتھیار تکبر کا ہے۔ اور وہ کس قدر مہلک ہتھیار ہے؟ حضورﷺ فرماتے ہیں:((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ كِبْرٍ)) [(۱)] ''وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہو سکتا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی کبر ہے''۔ حقیقت کے اعتبار سے تکبر شرک کی بدترین صورت بنتی ہے۔ یہ شرکِ معنوی ہے' شرکِ خفی ہے۔ شرکِ خفی اور شرکِ جلی پر میں بہت بحثیں کر چکا ہوں کہ اس میں فرق صرف یہ ہے کہ شرکِ جلی وہ ہے جو نظر آتا ہے' جس پر کسی مفتی کا فتویٰ لگ جائے گا اور شرکِ خفی وہ ہے جو نظر نہیں آتا' وہ مفتی کے فتوے کی زد میں نہیں آئے گا' لیکن شرک ہونے کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ شرکِ جلی بڑا شرک ہے اور شرکِ خفی چھوٹا شرک ہے۔ بڑے اور چھوٹے شرک کی نسبت اگر آپ نے جلی اور خفی کے حوالے سے کی ہے تو یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ تو یہ تکبر درحقیقت بہت بڑا شرک ہے' اس لیے کہ اس کے لیے حدیث قدسی میں الفاظ یہ آئے ہیں:((اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ)) [(۲)] ''تکبر تو میری چادر ہے''۔ گویا جو کوئی تکبر کرتا ہے وہ میرے کاندھے سے میری چادر گھسیٹ رہا ہے۔

(۱) سنن الترمذی' کتاب البر والصلة عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فی الکبر۔

(۲) سنن ابی داوٗد' کتاب اللباس' باب ما جاء فی الکبر۔ وسنن ابن ماجه' کتاب الزهد' باب البراءة من الکبر والتواضع۔

اور عرب میں یہ کسی کی سب سے بڑی توہین تھی۔ عربوں کے لباس میں ان کی شخصیت اور وجاہت کا انڈکس ان کی چادر ہوتی تھی۔ وہ چادر جو خواتین اوڑھتی تھیں جلباب کہلاتی تھی' جس کا ذکر سورۃ الاحزاب میں آیا ہے۔ وہ اپنے پورے جسم کو اس چادر کے اندر لپیٹ کر نکلتی تھیں۔ اسلام نے اس میں صرف یہ اضافہ کیا کہ اس چادر کا ایک حصّہ چہرے پر لٹکا لیا جائے' ورنہ پہلے سے وہ چادر اُن کے لباس کا جزوِ لازم تھی۔ اسی طرح مَردوں کے لباس میں بھی چادر کو خصوصی اہمیت حاصل تھی' جیسے آج کل پٹھانوں کے لباس میں چادر جزوِ لازم ہے' جو ان کے کندھے پر ہوتی ہے' اور وہ بڑی کثیر المقاصد (multipurpose) چادر ہوتی ہے۔ بوقت ضرورت وہ مصلّی بنتی ہے' وہی سونے کے کام آتی ہے۔ وہ رفع حاجت کے لیے بیٹھتے ہیں تو اپنی اس چادر کو اپنے گرد بالکل ایک خیمے کی طرح تان لیتے ہیں۔ تو یہ بڑی ''ملٹی پرپز'' چادر ہے۔ [(۱)] عرب میں بھی چادر لباس کا جزوِ لازم تھا اور ہر شخص اپنے جاہ ومرتبہ اور مالی حیثیت کے لحاظ سے چادر اپنے کندھے پر رکھتا۔ گویا اس چادر سے انسان کا رتبہ معین ہوتا تھا۔ اب کسی کی چادر اس کے کندھے سے گھسیٹ لینے کا مطلب اسے بےعزت کر دینا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''کبر میری چادر ہے''۔ یہ جامہ صرف مجھ کو راست آتا ہے۔ اگر کوئی متکبر ہے تو گویا اس نے میرے کاندھے سے میری چادر گھسیٹی ہے' اس سے میرا اعلانِ جنگ ہے۔

(۱) افغانستان میں روس کے خلاف جہاد میں افغان مجاہدین اپنی چادر کے ذریعے روسی ٹینکوں کا شکار بھی کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنی چادر کو گیلا کر کے چلتے ہوئے ٹینک پر ایک خاص انداز سے پھینکتے تو یہ ٹینک کے chain میں پھنس جاتی اور ٹینک رک جاتا اور مجاہدین اس پر قبضہ کر لیتے۔ (اضافہ از مرتب)

یہ تکبر اس راہ کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ یہ پندار کہ میں نے اس راہ میں یہ کچھ کھپا دیا‘ میں نے تو بہت دولت صرف کر دی‘ اپنی جوانی کھپا دی‘ اپنی توانائیاں لگا دیں‘ یہ چیز تکبر کی بدترین بنیاد بن جائے گی۔ اس کے برعکس یہ خیال ہو کہ یہ سب کچھ اس کی دین ہے‘ اس نے عطا کیا ہے‘ اس نے توفیق دی ہے‘ اس نے تیسیر فرمائی ہے‘ اس نے ایسے مواقع پیدا فرما دیے‘ وہ مواقع اگر نہ ملتے تو نہ معلوم ہم کہاں بھٹک رہے ہوتے! کس نالی میں گرے ہوتے! آخر شراب پی کر نالیوں میں گرے ہوئے لوگ بھی تو ملتے ہیں‘ وہ بھی انسان ہیں‘ پتا نہیں کس وقت اس کا پاؤں پھسل گیا اور ایک مرتبہ کی لغزش اسے کہاں سے کہاں لے گئی۔ ہماری نہ معلوم کتنی لغزشیں ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے پردہ پوشی فرمائی ہے‘ کتنی خطائیں ہیں جن سے درگزر فرمایا ہے۔ اب یہ احساس اگر ہو کہ یہ اللہ کا فضل ہے‘ اس میں میرا کوئی ذاتی استحقاق نہیں تھا‘ کوئی میرا دعویٰ (claim) نہیں تھا‘ جو کچھ ملا ہے صرف اس کی عطا‘ اس کا فضل اور اس کی دین ہے‘ تو انسان تکبر سے بچ جائے گا۔ ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ﴾ ’’یہ اللہ کا فضل ہے‘ وہ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے‘‘۔

دو صفاتِ الٰہیہ کے حوالے سے حسد کا سدّ باب

آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ؀﴾ ’’اور اللہ بہت وسعت والا‘ جاننے والا ہے‘‘۔ اس آیت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ کی یہ جو دو صفات آئی ہیں اس مضمون کے ساتھ ان کی نسبت اور تعلق تلاش کیجیے! آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس میں حسد کی جڑ کٹتی ہے۔ اگر اللہ نے کسی کو اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے تو جلتے کیوں ہو؟ اللہ کے فضل کا خزانہ محدود تو نہیں ہے‘ تم اس سے مانگو‘ وہ تمہیں دے گا۔ اس راستے میں آ کر بربادی کا جو اصل سبب بنتا ہے وہ اوّلاً تکبر اور ثانیاً حسد ہے۔ حدیث نبویؐ کے مطابق حسد نیکیوں کو اس طرح جلا دیتا ہے جیسے آگ ایندھن کو جلا دیتی ہے۔ حسد اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے اسے یہ شے کیوں دے دی؟ حسد مال و دولت پر بھی ہوتا ہے اور اس بات پر بھی کہ فلاں کو یہ رتبہ کیوں مل گیا۔ لیکن جب یہ خیال ہو کہ یہ اللہ کا فضل ہے جو اس پر ہوا ہے‘ اللہ نے اسے چن لیا ہے‘ یہ اس کی دین ہے‘ تو پھر حسد پیدا نہیں ہوگا۔ جب ہمیں اللہ سے محبت ہے تو راضی برضائے ربّ رہنا ہوگا۔ یہ بات حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں پر بھی آخر کار کھل گئی تھی‘ اگرچہ بہت دیر میں کھلی تھی۔ شروع میں حسد تھا کہ یوسف اور اس کا بھائی بنیامین ہمارے والد صاحب کو بہت زیادہ محبوب ہیں‘ حالانکہ ہم عُصبہ ہیں‘ ہم دس جوان ہیں‘ ہم دست و بازو ہیں‘ کوئی مقابلہ پیش آئے گا تو لاٹھیاں لے کر مقابلے میں ہم آئیں گے‘ مگر یہ چھوٹے چھوٹے دو بچے جو ہیں ان پر زیادہ عنایت ہے‘ زیادہ شفقت ہے۔ لیکن جب وہ مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس آخری مرتبہ خستہ حالی کی کیفیت میں پہنچے اور جب وہ حقیقت منکشف ہوئی کہ یہ یوسف ہیں تو وہ پکار اٹھے: ﴿تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا﴾ ’’اللہ کی قسم (آج ہم تسلیم کر رہے ہیں کہ) اللہ نے آپ کو ہم پر ترجیح دی ہے‘‘۔ ہماری نسبت آپ کو پسند فرما لیا ہے۔

اس حقیقت کا اگر پہلے روز سے ادراک ہو جائے کہ یہ اللہ کا انتخاب (choice) ہے‘ اللہ کی پسند ہے‘ اللہ نے جس کو جو چاہا دے دیا‘ تو پھر حسد نہیں ہوگا۔ یہ اس کا اختیار خصوصی ہے‘ جس طرح چاہے استعمال کرے۔ اور یہ بھی سوچیں کہ آخر اس کا خزانہ خالی تو نہیں ہوگیا! تم بھی اس سے مانگو۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں نے آپ کو سنائے تھے کہ دستک دو‘ کھولا جائے گا‘ مانگو‘ دیا جائے گا...... تم میں سے کون ایسا ہے کہ اس کا بیٹا اس سے مچھلی مانگے اور وہ اسے سانپ پکڑا دے! تم اپنی اولاد کے ساتھ اگر یہ نہیں کرتے تو کیا وہ تمہارا آسمانی باپ اگر تم اس سے مانگو گے تو کیا تمہیں نہیں دے گا؟ مانگ لو اس سے‘ اس کا خزانہ تو اتھاہ ہے۔ اس سے تم مانگو‘ وہ تمہیں دے گا۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کو ایک پہلو سے نواز دے‘ کسی دوسرے کو کسی دوسرے پہلو سے نواز دے۔ وہاں تو قسم قسم کی نعمتیں ہیں‘ انواع واقسام کے رنگا رنگ ہیرے اور موتی ہیں‘ وہ واسع ہے‘ بڑی وسعت والا ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ؀﴾

’’علیم‘‘ میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ وہ جس کو جو کچھ دیتا ہے اپنے علم کی بنیاد پر دیتا ہے کہ کون کس شے کا اہل ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں بھی آیا ہے کہ اپنے بچوں کے حصے کی روٹی کتوں کے آگے مت ڈالو۔ کون کس شے کا اہل ہے‘ دیکھ کر دو۔ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ جس کو جو کچھ دیتا ہے الل ٹپ نہیں دیتا۔ بسا اوقات کسی کو دولت سے محروم کرنا اس کے لیے بہتر ہوتا ہے۔ ایک شخص کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علم کامل میں ہے کہ یہ ضعیف ہے‘ اپنی خواہشات پر قابو نہیں رکھ سکتا‘ دولت کی فراوانی ہوگی تو عیاشیوں میں مبتلا ہو جائے گا۔ اگر اس وجہ سے اللہ نے ہاتھ روکا ہوا ہے تو اللہ اس کے لیے خیر کر رہا ہے‘ شر تو نہیں کر رہا ہے۔ اس سے اس دولت کا روک لینا اور رزق میں تنگی کر دینا اس کے لیے خیر ہے‘ شر نہیں ہے۔ تو وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے علمِ کامل کی بنیاد پر کرتا ہے کہ کسے کیا دینا ہے اور کیا نہیں دینا‘ کون کس چیز کا اہل ہے اور کس چیز کا اہل نہیں ہے۔ تو وہ واسع بھی ہے اور علیم بھی ہے۔ جو مانگنا ہے اس سے مانگو۔ البتہ اس پر راضی بھی رہو کہ جو اُس نے ہمیں دیا ہے یقیناً یہی ہمارے لیے خیر ہے۔

بارك اللّٰه لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم ○○